1391

سرسیّد کی تعزیتی تحریریں

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

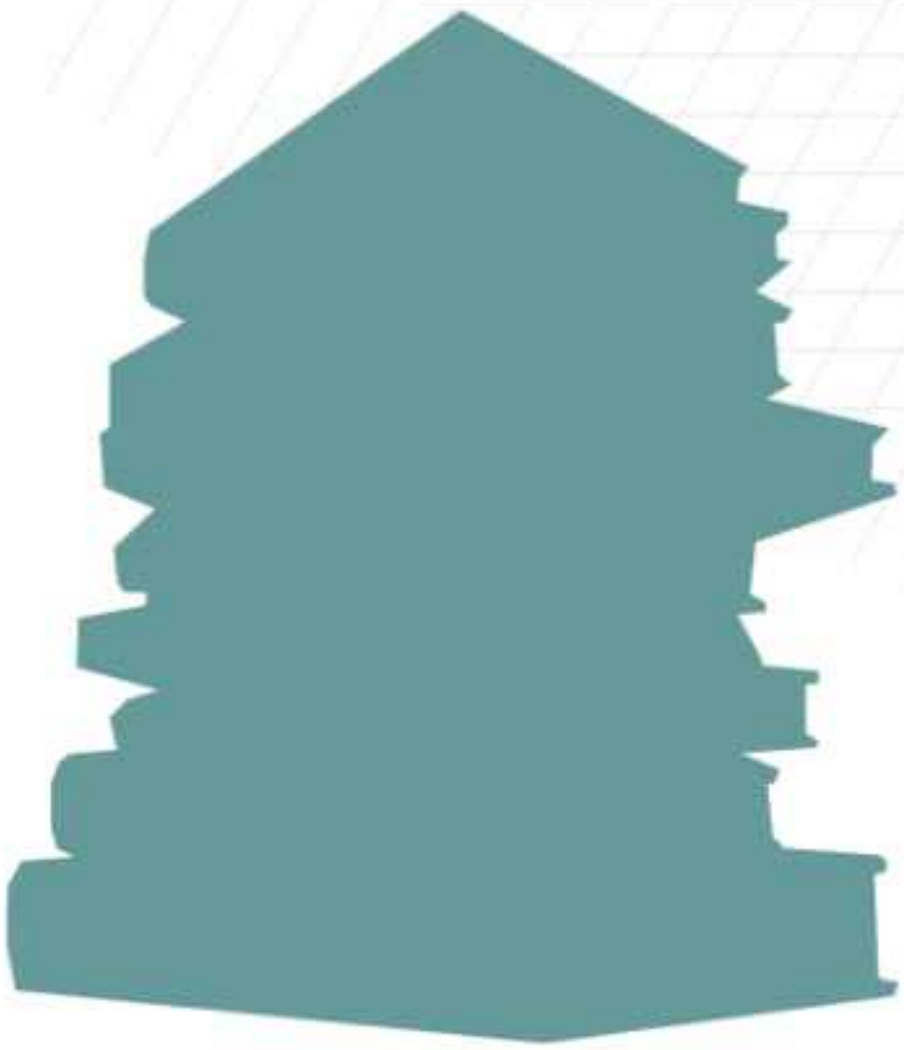

سرسیّد کی تعزیتی تحریریں

مُرتّبہ

اصغر عبّاس

ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ

129427

سنہ اشاعت: ۱۹۸۹ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: 20/-

مطبع: ایم۔ اے پرنٹرس ، دہلی

ایجوکیشنل بُک ہاؤس
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
فون ۳۷۶۸

فہرس

مقدمہ ۷

علما اور مبلغین

۱۔ جناب مولوی قاسم صاحب مرحوم ۱۴
۲۔ جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم ۱۷
۳۔ دیانند سرستی کی وفات ۱۹
۴۔ بابو کیشب چندر سین مرحوم ۲۱
۵۔ مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم ۲۲
۶۔ جناب حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم ۲۳
۷۔ مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی فرنگی محلی ۲۵
۸۔ شمس العلماء مفتی میر عباس صاحب مرحوم ۲۷
۹۔ پنڈت گورودت صاحب ایم اے ۲۸
۱۰۔ وفات نواب صدیق حسن خاں بھوپال ۲۹
۱۱۔ ہائے! شمس العلماء مولوی محمد حسن مرحوم صادقپور کا ۳۰
۱۲۔ وفات مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ۳۲
۱۳۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم ۳۳
۱۴۔ حضرت شاہ فضل رحمٰن رحمۃ اللہ ۳۵

اہل علم وفن

۱۵۔ ہنری فرڈیننڈ بلوک مین کی وفات ۳۸

۱۶۔ نواب ضیاء الدین خاں رحمۃ اللہ ۳۹

۱۷۔ حکیم محمود خاں صاحب مرحوم ۴۰

طلبائے کالج

۱۸۔ مولوی محمد ایوب مرحوم ۴۳

۱۹۔ افسوس صد افسوس ۴۴

۲۰۔ خلیفہ سید مہدی حسن مرحوم ۴۶

۲۱۔ خلیفہ سید عنایت حسین مرحوم ۴۷

احباب و معاصرین

۲۲۔ حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرحوم ۵۰

۲۳۔ ہائے منشی محمد رمضان اور وائے مولوی مرزا فتح محمد بیگ ۵۱

۲۴۔ سید میر ظہور حسین مرحوم ۵۲

۲۵۔ خان بہادر قاضی سید رضا حسین مرحوم ۵۳

۲۶۔ خان بہادر مولوی محمد کریم مرحوم ۵۵

اہلِ صحافت

۲۷۔ مولوی سید وثوق علی صاحب مرحوم ۵۹

۲۸۔ افسوس صد افسوس ۶۱

۲۹۔ انتقال پُر ملال شمس العلماء خان بہادر مولوی کبیر الدین احمد صاحب ۶۲

ملازمین مدرسۃ العلوم

۳۰۔ حافظ عبدالرزاق مرحوم ۶۴

۳۱۔ وفات منشی ذوالفقار خاں ۶۵

۳۲۔ وفات احمد حسین خاں بی اے ۶۶

۳۳۔ لالہ گلاب رائے ۶۷

رؤسا و اہلکارانِ حکومت

۳۴۔ واقعۂ جانکاہ	۶۹
۳۵۔ واقعۂ جانکاہ	۷۱
۳۶۔ وفات مولوی سید اعظم الدین خاں	۷۲
۳۷۔ وفات دیوان کرپا رام	۷۳
۳۸۔ افسوس افسوس ہزار افسوس	۷۵
۳۹۔ حاجی فیض احمد خاں	۷۷
۴۰۔ ڈبلو ایچ اسمتھ صاحب	۷۸
۴۱۔ نواب مرزا فیروز حسن خاں مرحوم	۷۹
۴۲۔ جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم	۸۰
۴۳۔ وفات شیخ اعتقاد علی	۸۲
۴۴۔ حاجی الحرمین الشریفین نواب کلب علی خاں بہادر	۸۳
۴۵۔ مہاراجہ بہادر بنارس مرحوم	۸۵
۴۶۔ انتقال پُر ملال نواب سر سالار جنگ	۸۷
۴۷۔ وفات مولوی عبدالقیوم صاحب	۹۰
۴۸۔ دہلی اور دو نامی اور لائق شخصیتوں کی وفات	۹۱
۴۹۔ نواب منیر الملک مرحوم	۹۲
۵۰۔ جنرل اعظم الدین خاں مرحوم	۹۳
۵۱۔ بابو ابھیناش چندر مرحوم	۹۴
۵۲۔ نواب احمد اللہ خاں مرحوم	۹۶
۵۳۔ میر ضامن علی صاحب مرحوم	۹۷
۵۴۔ نواب عبداللطیف خاں مرحوم	۹۸

۵۵۔ میر محمد حسین مرحوم ۹۹

۵۶۔ وفات وزیرالدولہ خلیفہ محمد حسن خاں بہادر ۱۰۰

۵۷۔ راجہ شیوپرشاد ۱۰۱

۵۸۔ زندگی اور موت ۱۰۲

۵۹۔ مرثیہ مصائبِ اندلس ۱۰۶

۶۰۔ حواشی ۱۱۳

۶۱۔ مآخذو مصادر ۱۳۴

مقدمہ

وفیات کو ہمارے مشرقی ادب میں خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔کسی شعبہ کے اعیان وعمائدین کی وفات پر اہلِ قلم کے تاثرات وقتی یا ہنگامی نوعیت کے نہیں ہوتے تھے اور بالعموم سوانحی دلچسپی کے ساتھ ادبی رنگ بھی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادبیات میں ایسی بہت سی تصانیف ہیں جو اہلِ کمال کی وفات کا تعین کرتی ہیں اور آج بھی اکثر محققین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔اردو میں اس کی روایت صحافت کی ترقی کے ساتھ پروان چڑھی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجرار کے بعد اخبارات کے کالم میں سرسید نے اسے ایک صنف کی حیثیت عطا کی اور ایک موقر مقام بخشا۔

سرسید ایک ہمہ رنگ طبیعت کے مالک تھے۔ان کی کتاب زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ شروع ہی سے عام روایتوں سے بیزار بھی تھے، اپنے دور کی زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونا بھی چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ماضی کے گرویدہ بھی تھے۔انھیں اصحابِ کمال اور عظمتِ رفتہ سے گہرا تعلق تھا۔اسی لئے اپنی علمی زندگی کی ابتدا ہی میں جب انھوں نے آثارالصنادید لکھی جو آثارِ عتیق پر ایک اہم تصنیف ہے تو اس کے چوتھے باب میں دہلی کے اہلِ علم و فضل پر اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار ایک اہلِ نظر کی طرح کیا۔اس سے آگے کی طرف دیکھنے کے ساتھ ماضی کی عظمت کے احساس کا بھی علم ہوتا ہے۔آثار کے اس باب میں کہیں دہلی کے اہلِ کمال کے دنیا میں نہ ہونے کی چبھن رہ رہ کر ابھرتی ہے۔کہیں اُن کے احباب کے جاذب توجہ نقوش نظر آتے ہیں کہیں وہ دلی کو یاد کرنے لگتے ہیں جو ان کے دیدۂ دل میں بسی ہوئی ہے اور کہیں زندگی کی وہ قدریں جن پر اُن کا ایمان تھا ان کے ممدوحین کی یاد کے سہارے نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں اُن کا یہ رجحان پایانِ عمر تک برقرار رہا۔گزٹ کے اوراق میں جب وہ اپنے

معاصرین اور دوستوں کے ابدی فراق پر قلم اٹھاتے ہیں تو احساس جدائی کے ساتھ انھیں یہ خیال بھی بے چین کرتا ہے کہ وہ جہانِ تازہ جس کے وہ منتظر ہیں اُن کے رفیقوں کے اُٹھ جانے سے کچھ دور ہوتا نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے افق پر مسلمانوں کے فکری اور ثقافتی تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے علی گڑھ تحریک نمودار ہوئی اس کا آغاز سرسید نے کیا انکی آواز کا اثر رفتہ رفتہ برصغیر میں گہرا ہوتا چلا گیا۔ مختلف الخیال اور مختلف النوع شخصیتوں سے ان کے روابط قابلِ رشک حد تک وسیع اور اُستوار رہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ" محبت اور الفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لئے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے"۔ اسی محبت نے اپنے رفقاء سے ان کے تعلقات کو مضبوط اور دیرپا کیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ" جو برتاؤ سرسید کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانے کے دوستوں سے بالکل نرالا تھا۔۔۔۔ ان کو شاید کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسی اپنے خالص اور مخلص دوستوں سے مل کر، ہوتی تھی وہ فی الواقع دوستوں کو زندگی کا ایک عنصر سمجھتے تھے ان کا اس مقولہ پر پورا پورا عمل تھا کہ اگر ساری دنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے۔ اور اگر ساری دنیا کے بدلہ میں ایک دوست مل جائے تو ارزاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کے لئے انھیں کارکنوں کی تلاش نہیں رہی مخلص رفقاء ان کو ملتے رہے اور کلکتہ سے لے کر حیدرآباد تک انھوں نے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ سرسید نے ایک جگہ خود بھی خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ" اس نے انھیں ایسے دوست دیئے جو اس زمانہ میں عجائبات سے ہے"۔

ان میں سے جب کسی دوست کی وفات ہو جاتی تو وہ اپنے حافظہ کی قیمتی یادداشت کو تاثرات کی شکل میں اس طرح پیش کرتے کہ اس کی سیرت کے اہم خطوط اور اس کی شخصیت کے نمایاں اکتسابات، اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجاتی۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا ذکر کرتے ہوئے سرسید ان کا سراپا بیان کرتے ہیں۔

" دُبلے پتلے اور پست قد مگر نہایت پاکیزہ رو اور متناسب الاعضا تھے رنگ نہایت صاف تھا اور چہرے سے ملاحت ٹپکتی تھی۔ مزاج میں نفاست تھی خوش لباس اور خوش وضع تھے"۔

سرسید شخصیت کی تعمیر میں فضائل کو نمایاں کرتے ہیں اور اخلاقی پیمانے مدنظر ہوتے ہیں۔

اپنے گہرے دوست سید میر ظہور حسین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سید میر ظہور حسین نیکی اور اخلاق اور محبت اور دوستی کی مجسم صورت تھے۔ خدا ترسی کوٹ کوٹ کے خدا نے ان کے دل میں بھری تھی۔ نہایت رقیق القلب تھے۔ خیر و خیرات خصوصاً مخفی طور پر کرنے کی ان کی عادت بلکہ جبلت تھی۔ مہمان نوازی میں اپنے جد بزرگوار ابراہیم علیہ السلام کے پیرو تھے۔ کوئی چیز ان کو مہمان نوازی سے زیادہ خوش کرنے والی نہ تھی۔"

سرسید کی ان تعزیتی تحریروں میں کہیں کہیں واقعہ نگاری بھی ملتی ہے اپنے مخلص دوست محمد کریم کی وفات کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"چار بجے کے قریب خود اُٹھے، نوکروں کو جگایا ٹکٹ لیا جب، ریل چلنے کا وقت آیا وہاں آئے ریل گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسے اور بہت جلد نکل آئے اور کہا میرا دل گھبراتا ہے اور گرمی معلوم ہوتی ہے۔ چغہ اتار پھینک دیا ٹوپی اتار ڈالی گھبراہٹ اور بیقراری زیادہ معلوم ہوئی اور پلیٹ فارم ہی پر بیٹھ گئے نوکروں نے یہ حال دیکھ کر اسباب اتار لیا اور پلیٹ فارم پر ایک گدا بچھایا اس پر لیٹے بے قراری سے ادھر ادھر دو ایک کروٹیں بدلیں اور کہتے رہے کہ خدا رحم کرا اللہ رحم کر بس خاموش ہو گئے۔"

کہا جاتا ہے کہ کسی زندگی کا اختصار کے ساتھ ایسی مرکب تصویر پیش کرنا جس میں شخصیت کے اہم پہلوؤں کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو خاکہ نگاری کہلائے گا۔ اس لحاظ سے، سرسید کی بعض تعزیتی تحریریں نہ تو نوحۂ جانگسل کے ضمن میں آتی ہیں اور نہ صرف اظہار رنج و غم تک محدود رہتی ہیں بلکہ انکا شمار ہمیں خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کے حوالے سے کرنا چاہیئے۔

سرسید نے جن مرحوم معاصرین پر قلم اٹھایا ہے اس سے نہ صرف مرحومین کی زندگی کے بعض نقوش واضح ہوتے ہیں بلکہ خود سرسید کی افتادِ طبع تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ یہ تحریریں ان کی کشادہ ذہنی وسعتِ قلب، رواداری اور ہر قسم کی عصبیت سے اُن کی کنارہ کشی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں انکی یاد رفتگاں میں متعدد ایسی شخصیتیں شامل ہیں مثلاً دیانند سرسوتی، مولانا محمد قاسم نانوتوی مفتی میر عباس راجہ شیو پرشاد پنڈت گوردت، دیوان کرپا رام نواب عبداللطیف جو ایک دوسرے سے خیالات اور اقدار کے لحاظ سے متضاد تھیں مگر سرسید نے ہر شخصیت سے ان عناصر کو چن لیا جن سے انسانیت اور رواداری کو فروغ ملتا ہے اور جنھیں ہر زمانے میں تاریخ کے اُلٹ پھیر کے باوجود قابلِ قدر تسلیم کیا جائے گا۔ مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعض سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اسکی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لئے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے لئے تھا۔"

برہمو سماج کے مشہور مبلغ بابو کیشب چندر سین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بابو کیشب کی فصاحت اور دلی جوش جو اسپیچوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ بے مثل و بے نظیر تھا نہایت مشکل ہے کہ کوئی شخص انکا پورا جانشین ہو سکے ایسے شخص کے دنیا سے چلے جانے کا جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔"

آریہ سماج کو اپنے افکار سے سیراب کرنے والوں میں پنڈت گوردت ایم اے کا نام امتیاز کا حامل ہے وہ ویدوں کے زبردست عالم اور سحر بیان مقرر تھے۔ سرسید انکی وفات پر لکھتے ہیں:

"وہ آریہ سماج لاہور کے نہایت ممتاز ممبر تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ انھیں نے تمام تعلقات سے قطع نظر کر کے آریہ سماج کی ترقی پر اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا نہایت معزز نوکریاں انکو ملتی تھیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیں اور آریہ سماج کی ترقی اپنی زندگی کا مقصد سمجھا یہی ایک ایسی بات ہے کہ ان کی تمام خوبیوں کیلئے کافی ثبوت ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ایسے شخص نے چھپن برس کی عمر میں ۱۹ مارچ ۱۸۹۰ء کو مدقوق ہو کر انتقال کیا۔ ہزاروں آدمیوں نے ان پر ماتم کیا۔ ان کے جنازہ کو جس قدر عزت دی جا سکتی تھی وہ دی مگر اس سے کیا ہوتا ہے جو نقصان قوم کو اور خصوصاً آریہ سماج کو اُن کے مرنے سے پہنچا اس کی تلافی نہیں ہو سکتی ہمارے نزدیک کسی قوم کسی مذہب کا آدمی ہو مگر کوئی کمال رکھتا ہو اس کا مرنا انسانوں کے لئے مصیبت ہے جس کے لئے سب کو ماتم کرنا چاہیئے۔"

واقعہ یہ ہے کہ کوئی تحریک صرف اپنے صفِ اول کے رہنماؤں سے نہیں پھیلتی بلکہ اوسط درجہ کے ارکان کی کوششوں کی مرہونِ منّت ہوتی ہے اور انھیں کے سہارے قائم رہتی ہے۔ وفیات کے اس مجموعہ میں جن مرحومین کا ذکر ہے ان میں بیشتر کا علی گڑھ تحریک سے

کسی نہ کسی نوع کا تعلق ہے اور ان میں بیشتر ایسے ہیں ہیں جن میں تحریک کے ممتاز اراکین کی سی وجاہت اور لیاقت نہیں لیکن قومی درد اور خلوص میں وہ کسی سے کم بھی نہ تھے۔ ان لوگوں پر سرسید کے اسلوب زندگی اور انکے مجاہدانہ عزائم کے نقوش آسانی سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے تحریک کو استوار کرنے اور برصغیر کے طول و عرض میں پھیلانے میں جو رول انجام دیا ہے اُسے نظرانداز کرنا مشکل ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے ہندوستان کے ایک ناص دور اور ایک تحریک کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک کتنی ہمہ گیر تھی

سرسید کی یہ تعزیتی تحریریں پُرسوز اور کرب انگیز جذباتی فضاؤں کی پروردہ ہیں اس لئے ان میں وہ تخ بستہ منطقیت نہیں جو ان کے علمی مضامین کا خاصہ ہے۔ ان تحریروں میں کہیں خود کلامی اور کہیں بات چیت کا انداز ہے جو ہر طرح کے تصنع اور بناوٹ سے عاری ہے یہ تحریریں ہمیں اپنی بات کا یقین دلاتی اور اس یقین میں ہم کو شریک کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اس لئے ان کی اثر آفرینی دیرپا ہے یہاں اس قسم کی تحریروں کی مثالیں اس لئے نہیں دی گئیں کہ اس سے ساری کتاب بھری ہے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ تحریک کا ترجمان تھا اس کا اجراء سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی طرف سے ۳ر مارچ ۱۸۶۶ء کو ہوا تھا۔ یہ اخبار پابندیٔ اوقات کے ساتھ متواتر بتیس برس تک شائع ہوتا رہا۔ حالی لکھتے ہیں:

"اس اخبار کا ایڈیٹوریل کا اہتمام ابتداء سے آخر تک سوائے ان ایام کے جب کہ سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے انھیں کے ہاتھ میں رہا" جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر سرسید علی گڑھ آگئے تو ۷ر مئی ۱۸۷۷ء کو اخبار کی ادارت کا اہتمام انھوں نے باقاعدہ اپنے ہاتھ میں لے لیا" حالی لکھتے ہیں کہ جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے آخر تک اس اخبار میں سرسید کے قلم سے نکلے اگر ان کو ایک جگہ فراہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں "اکمل الاخبار" دہلی نے بھی لکھا تھا کہ اس اخبار کے شاذ و نادر ہی ایسے پرچے نکلیں گے کہ جن میں اخبار کے ایڈیٹر کا کوئی طویل یا مختصر آرٹیکل نہ ہو" واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے گزٹ میں اپنے دور کے ذروں سے لے کر ستاروں تک ہر موضوع پر لکھا اور اتنا لکھا کہ کیفیت و کمیت اور دردِ دل کے لحاظ سے اردو کا کوئی ادیب اُن کے قد کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ اس اخبار میں سرسید کی بیشمار

ایسی تحریریں مستور ہیں جن پر انکا نام درج نہیں۔ ان کی تعزیتی تحریریں بھی اس ضمن میں آتی ہیں لیکن اندرونی شواہد، قرائن، انداز قد، سرسید سے مرحومین کے روابط اور واقعات کی ترتیب کی بناء پر حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریریں سرسید کی ہیں انھیں پہلی بار کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ وفیات کے علاوہ اس مجموعہ میں سرسید کا ایک تمثیلی مضمون زندگی اور موت بھی ہے جو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے سید حامد کے انتقال کے دو ہفتے بعد لکھا ہے اس کا تعلق وفیات سے ہے اس لئے اسے بھی ان کی تعزیتی تحریروں میں شامل کیا گیا ہے اس کے علاوہ سید یحییٰ قرطبی کا عربی مرثیہ جس کا ترجمہ اردو میں سرسید نے مرثیہ مصائب اندلس کے عنوان سے کیا ہے اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کیا ہے یہی مرثیہ ہے جسے دیکھ کر سرسید نے حالی سے مسدس کی فرمائش کی تھی؛ اتفاق سے ان دونوں تحریروں پر بھی نام کا اندراج نہیں لیکن مذکورہ بالا وجوہ سے اسے سرسید کی تحریر قرار دیا جائے گا۔

اس مجموعہ میں سرسید کے بیشتر اعوان و انصار کے مختصر حالات حواشی کے عنوان سے شامل کئے گئے ہیں جن سے وفیات کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سرسید کے دوست محمد کریم کے کچھ حالات ہمیں ان کے پوتے اور میرے عزیز مدحت کریم فاروقی سے دستیاب ہوئے ہیں جس کے لئے میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوں آخر میں مآخذ و مصادر کی فہرست شامل ہے۔

اس موقعہ پر میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ میں اپنے شفیق اساتذہ کرام جناب ڈاکٹر پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر ڈاکٹر محمود الٰہی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے ہر ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں پروفیسر نورالحسن خاں لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے لائبریری کی سہولیتیں بہم پہنچائیں۔ ذخیرۂ سرسید سے ان کی دلچسپی اور سعیٔ پیہم سے امید ہے کہ بانیٔ درسگاہ کی تحریروں کا یہ اہم ترین ذخیرہ جو اور کہیں دستیاب نہیں دست برد زمانہ سے محفوظ و مامون رہے گا۔

اصغر عباس

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علماء اور مبلغین

جناب مولوی محمّد قاسمؒ صاحب مرحوم

افسوس ہے کہ جناب ممدوح نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری سے بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اسکا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم اور فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بھی بے مثل تھے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمّد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت **مولوی محمد اسحاق** صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں اُن سے زیادہ۔

بہت کم لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمّد قاسمؒ صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے ہوئے دیکھا ہے انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتداہی سے آثارِ تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کی اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیلِ علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہلِ فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلی کی صحبت نے اتباعِ سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا

کردیتھا اور حاجی امداد اللہ صاحب کی فیضِ صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی نہایت پابندِ شریعت اور سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابندِ شریعت و سنت کرنے میں زاید از حد کوشش کرتے تھے بایں ہمہ ایک عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انھیں کی کوششوں سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے وہ کچھ خواہش پیر اور مُرشد بننے کی نہیں رکھتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصًا اصلاعِ شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائلِ خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم کے کسی فعل کو خواہ وہ کسی ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو کہ وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اسی کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ بُرے کام کرتا ہے یا بُری بات کہتا ہے خدا کے واسطے بُرا جانتے تھے۔ مسئلہ حب اللہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں ہم اپنے دل سے اُن کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہے بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر انکا پایہ مولوی اسحاق صاحب سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا۔ ان لوگوں کے لئے جو اِن کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور

ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو رہیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ اُن کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

و ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء

جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم

جناب مولوی محمدؐ قاسم صاحب مرحوم کے واقعہ کی خبر ہم لکھ چکے تھے کہ دفعتًا ہم کو دوسری ویسی ہی حسرتناک خبر جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارنپوری کے واقعۂ جانکاہ کی پہنچی جناب موصوف نے مولوی محمدؐ قاسم صاحب کی رحلت سے دوسرے دن اس جہانِ گذران سے بمقام سہارنپور رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی محمدؐ قاسم صاحب کے واقعہ کے متصل اس واقعہ کا ہونا اور بھی زیادہ حسرت اور افسوس کا باعث ہے ایک ہی وقت میں دو ایسے بزرگانِ دین کا ایک ہی حصّہ ملک سے اٹھ جانا درحقیقت نہایت اندوہناک واقعات ہیں۔ مولوی احمد علی صاحب اگرچہ اب بہت ضعیف ہو گئے تھے لیکن باایں ہمہ بہت غنیمت تھے۔ اُنھوں نے حدیث کو اس طریق پر حاصل نہیں کیا تھا جس طرح اور اکثر علماء کا دستور ہے کہ سند کے سلسلے کو درست کرنے کی نیت سے کسی کتاب کے چند ورق یا چند جزو کسی صاحب سند عالم سے پڑھ لئے اور بے فکر ہو گئے۔ جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم نے تمام کتب صحاح اور بعض دیگر کتب حدیث کو من اولہ الیٰ آخرہ جناب مولوی محمدؐ اسحاق صاحب سے سبقًا سبقًا پڑھا تھا اور جب کہ مولوی محمدؐ اسحاق صاحب نے دہلی سے ہجرت فرمائی تو مولوی احمد علی صاحب بھی مکہ معظمہ کو تشریف لے گئے اور خاص حرم بیت اللہ میں حدیث کی کتابوں کو مولوی محمد اسحاق صاحب سے تمام کیا اور اس کے بعد ہندوستان کو واپس آئے اور یہاں پہنچکر انھوں نے حدیث کی کتابوں کو نہایت عمدگی اور صحت سے چھاپا اور اس کو مشتہر کیا خصوصًا بخاری کو جس خوبی اور عمدگی سے انھوں نے چھاپا وہ ان کی ایک بے نظیر کوشش تھی۔

آخر عمر میں جناب ممدوح نے اپنے آپ کو مدرسہ اسلامیہ سہارنپور کی خدمات کے لئے جو کچھ اس وقت میں اُن سے ممکن تھیں وقف کر دیا تھا اور اسی شغل میں ان کا حسن خاتمہ ہوا خدا غریقِ رحمت کرے۔

یہی راہ سب کو چلنی ہے جو اس وقت زندہ ہیں ان کی نسبت بھی کسی وقت سُنا جاوے گا کہ نہیں ہیں۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

و ۱۶ر اپریل ۱۸۸۰ء

سوامی دیانند سرستی کی وفات

نہایت افسوس کی بات ہے کہ سوامی دیانند سرستی صاحب نے، جو زبان سنسکرت کے بہت بڑے عالم اور وید کے بہت بڑے محقق تھے۔ اکتیسویں اکتوبر ۱۸۸۳ء کو چھ بجے شام کے اجمیر میں انتقال کیا۔ علاوہ علم وفضل کے نہایت نیک درویش صفت آدمی تھے۔ ان کے معتقدان کو دیوتا جانتے تھے۔ اور بے شبہ اسی لایق تھے۔ اُنھوں نے ہندو مذہب میں بہت کچھ رفارم کیا تھا مورتی پوجن کے وہ نہایت مخالف تھے اور انھوں نے اس مسئلہ میں سب پنڈتوں پر فتح پائی تھی کہ درحقیقت وید میں مورتی پوجن نہیں ہے۔ وہ صرف جوتی سروپ نرنکار کے سوا دوسرے کی پوجا جائز نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اس بات کے ثابت کرنے میں بھی کوشش کی تھی کہ وید میں عناصر پرستی بھی نہیں ہے ہم وید کو بھی نہیں جانتے مگر بعض محققین سے جو ہندو مذہب بھی نہیں رکھتے ہم کو معلوم ہوا کہ اس امر میں ان کو بخوبی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم سے اور سوامی دیانند سرستی مرحوم سے بہت ملاقات تھی۔ ہم ہمیشہ ان کا نہایت ادب کرتے تھے۔ کیونکہ ایسے عالم اور عمدہ شخص تھے کہ ہر مذہب والے کو اُن کا ادب لازم تھا۔ شاید ہماری سمجھ کی غلطی ہو مگر ہم کو خیال ہے کہ سوامی صاحب میٹر یعنی مادہ کو جسے وہ مایا سے تعبیر کرتے تھے قدیم ازلی مانتے تھے۔ اگر انکا یہ خیال نہ ہوتا تو نسبت ذاتِ باری کے انکا اور مسلمانوں کا عقیدہ بالکل متحد تھا۔ بہرحال ایسے شخص تھے جن کا مثل اس وقت ہندوستان میں موجود نہیں ہے اور ہر شخص کو اُنکی وفات کا غم کرنا لازم ہے کہ ایسا بے نظیر شخص ان کے درمیان سے جاتا رہا۔

ان کے سبب سے ایک نئی شاخ ہندو مذہب میں قائم ہوگئی جو آریہ سماج کے نام سے مشہور ہے ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کسی مذہب میں مختلف شاخیں مختلف ناموں سے جُداگانہ قائم رہوں۔ مسلمانوں میں بھی جو شیعہ سنی، معتزلی شاخیں قائم ہیں وہ بھی ہم کو نہایت ناپسند ہیں۔ اس طرح سے

شاخیں قائم ہونے سے بعوض نیکی کے ایک دوسرے سے رشک وحسد وضد وعداوت پیدا ہوتی ہے مگر شاید یہ ایک طبعی امر ہے اور خواہ مخواہ جُدا جدا نام سے فرقے قائم ہو جاتے ہیں۔

ہم کو پنجابی اخبار سے معلوم ہوا کہ لاہور میں ان کی وفات پر ماتم کرنے کو ایک مجلس منعقد ہوئی اور بہت بڑا ہجوم ہوا۔ انکی وفات پر ماتمی لیکچر دیئے گئے اور ان کی یادگاری میں ایک سنسکرت پاٹ شالہ چندہ سے قائم کرنا قرار پایا۔ ہمارے نزدیک سوامی دیانند سرستی اسی لائق تھے کہ تمام لوگ جو ان کے معتقد تھے یا نہ تھے صرف ان کے فضل وکمال کے سبب ان کا غم کریں گے۔

۳۱ اکتوبر ۱۸۸۳ء

بابو کیشب چندر سین مرحوم

ہم نے اپنے پچھلے اخبار میں اس نیک دل شخص کی وفات کا ذکر لکھا تھا جو شخص کہ انسانیت کے جامہ میں درحقیقت انسان بھی ہے اسکو بابو کیشب کے جسم کے دنیا سے جاتے رہنے کا نہایت افسوس ہوگا۔ درحقیقت کیشب کا جسم دنیا کی آنکھوں سے چھپ گیا ہے مگر اس کی نیکیاں جو حقیقی اور اصلی کیشب چندر سین ہے، بہت زمانے تک دنیا میں زندہ و موجود رہیں گی۔ بابو کیشب چندر سین پکا موحد اور ایک خدا کا پوجنے والا تھا۔ تمام پیغمبروں اور اگلے نامی بزرگوں کا جن سے انسان نے کسی نہ کسی قسم کے فائدے حاصل کئے ہیں نہایت ادب کرتا تھا۔ اس نے اپنی قوم کے بہت بڑے گروہ سے بت پرستی اور بہت سی نامناسب باتوں کو ترک کرایا اور ایک نئی قوم مگر ایک خدا کو ماننے والی اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

بابو کیشب کی فصاحت اور دلی جوش جو اسپیچوں میں ظاہر ہوتا تھا بے مثل و بے نظیر تھا۔ نہایت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان کا پورا جانشین ہو سکے۔ ایسے شخص کے دنیا سے چلے جانے کا جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

۱۸۸۴ء

مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم

افسوس ہے کہ مولوی محمد مظہر صاحب نے جو عربی مدرسہ سہارنپور میں مدرس تھے اور انھیں کی ذاتِ بابرکات سے اس مدرسہ کو عزت اور رونق تھی۔ بروز شنبہ تیسری اکتوبر ۱۸۸۵ء کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی صاحب ممدوح بہت بڑے عالم تھے جس زمانہ میں دہلی میں طالب علم تھے اسی زمانہ میں انکی ذہانت مشہور تھی۔ تقویٰ میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ بیس برس سے انھوں نے اپنے ہم قوموں کو علوم دینی کی فیض رسانی پر کمر ہمت چست باندھی تھی اور عربی مدرسہ سہارنپور میں پاشکستہ ہوکر بیٹھ گئے تھے۔ آمدنی مدرسہ سے صرف پچیس روپیہ ماہواری بقدر بسر اوقات لیتے تھے اور علوم کی تعلیم میں مصروف تھے۔ بہت لوگ اُن سے فیضیاب ہوئے مگر افسوس ہے کہ اجل نے لوگوں کو اس فیض سے محروم کر دیا۔

زیادہ افسوس کی یہ بات ہے کہ جو شخص دنیا سے سفر کرتا ہے اس کا کوئی جانشین نہیں ہوتا۔ جناب مولوی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال کیا۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نے انتقال کیا درحقیقت کوئی ان کا جانشین نہیں ہوا۔ اب مولوی محمد مظہر صاحب نے انتقال کیا ہے۔ ہم کو تو ان کا بھی جانشین کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۳، اکتوبر ۱۸۸۵ء

129427

جناب حاجی حافظ مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم

مدرس عربی و منیجر بورڈنگ ہوس مدرسۃ العلوم علی گڑھ

ہم نہایت رنج اور بے انتہا غم والم سے اس خبر کو لکھتے ہیں کہ آٹھویں جولائی ۱۸۸۶ء روز پنجشنبہ مطابق پانچویں شوال ۱۳۰۳ھ ہجری کو جناب مولوی محمد اکبر صاحب نے بارہ بجے دن کے بمقام کاندھلہ اپنے وطن میں دفعتاً انتقال کیا اب کی دفعہ دورۂ بواسیر میں انکو خون زیادہ آگیا تھا مگر قبل رمضان اچھے ہوگئے تھے۔ رمضان کے روزوں نے ان کو سخت مضرت پہنچائی۔ گھر میں بیٹھے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے ایک ہچکی آئی اور چند منٹ میں کام تمام ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہندوستان میں جو پرانے نامی شریف خاندان ہیں ان میں اُن کا بھی خاندان تھا۔ زمانہ دراز سے اُن کے آبا و اجداد اہلِ علم ہوتے آئے ہیں جناب حاجی حافظ مولوی محمد نور الحسن صاحب انکے والد بزرگوار تھے جن کا علم و فضل کیا علم حدیث و فقہ تفسیر میں اور کیا منطق و فلسفہ میں اور کیا علم ادب میں اس نواح میں مشہور و معروف تھا۔ اُن کے پردادا مفتی الٰہی بخش صاحب تمام ہندوستان میں اپنے فضل و کمال میں معروف و مشہور تھے جس طرح کہ وہ علومِ ظاہری میں شہرۂ آفاق تھے اسی طرح علمِ باطنی میں بھی اہلِ باطن سے مسلم تھے۔ مولوی روم صاحب نے اپنا ساتواں دفتر مثنوی کا نہیں لکھا اور یہ پیش گوئی کی کہ کوئی دوسرا شخص اسکو پورا کرے گا۔ مولانا روم کی روح نے وہ مطالب ان کو القا کئے اور ساتواں دفتر انھوں نے پورا کیا۔ اس کام سے ان کی قدر و منزلت مسلمانوں میں اور بالتخصیص اہلِ باطن میں بہت زیادہ ہوگئی۔

مولوی محمد اکبر صاحب مرحوم فی نفسہٖ نہایت بزرگ اور باخدا شخص تھے۔ علوم عربیہ میں اس زمانہ میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے تمام کتابیں معقول و منقول کی اپنے والد بزرگوار سے

پڑھی تھیں اور معقول کی تکمیل تحصیل مولوی فضلِ حق صاحب مرحوم سے کی تھی۔ عربی زبان کے علم و ادب میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے مدرسۃ العلوم مسلمانانِ واقع علی گڑھ میں ابتداءً تقرّرِ مدرسہ سے عربی اور تعلیم مذہب اہلِ سنّت جماعت کے پروفیسر تھے اور انتظام بورڈنگ ہوس بھی اُن سے متعلق تھا۔ دن رات بورڈنگ ہوس میں رہتے تھے۔ اُن کی صحبت و فیض برکت کا طالب علموں پر نہایت عمدہ اثر پڑتا تھا۔ پس اُن کے انتقال سے مدرسۃ العلوم کو نہایت سخت صدمہ پہنچا ہے۔ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو ایسے شفیق اُستاد، بزرگ ذی علم حافظ حاجی منتظم بورڈنگ ہاؤس اور پروفیسر کے انتقال کا جو بہ شفقت پدرانہ ان کے ساتھ پیش آتا تھا اور کمیٹی مدرسۃ العلوم کو ایسے رفیق و شفیق مدرس کے انتقال کا جس قدر ماتم ہو سب بجا ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

۸ جولائی ۱۸۸۶ء

مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی فرنگی محلی

ہندوستان میں یادگارِ سلف ایک مولوی عبدالحئی صاحب رہ گئے تھے! افسوس زمانے نے انکو بھی ہم سے لے لیا۔ موجودہ حالات نے یہ اُمید، ہی منقطع کردی ہے کہ ان کا کوئی جانشین پیدا ہو۔ ان کی عمر چالیس سے کم تھی۔ اتنے ہی زمانے میں اُن کی تصنیفات کا شمار جو ہر ایک فن میں تھیں سو سے زائد ہو چکا تھا۔ مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی اور مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی اور مولوی صدیق حسن خاں قنوجی ثم البھوپالی سے معقول و منقول میں مناظرانہ تحریریں بھی رہیں۔ ابتدا میں آبائی طریقہ پر منطق و حکمت میں زیادہ تر اشتغال رہا مگر آخر میں بالکل دینیات کی طرح متوجہ تھے اور علم حدیث میں تو ان کے اسلاف میں بھی کوئی شخص ایسی واقفیت اور جامعیت کا نہیں گزرا۔ عموماً ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں ان کے فتویٰ نہایت مقبول اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کا تمام دن بلکہ رات کا بھی معتدبہ حصہ درس سبق و تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا تھا۔ ملا قطب الدین شہید سہالی کی اولاد میں تھے اور سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا تھا۔ ان کے اجداد اورنگزیب کے زمانے میں سہالی تشریف لائے اور پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔

دُبلے پتلے اور پست قد مگر نہایت پاکیزہ رو اور متناسب الاعضاء تھے۔ رنگ نہایت صاف تھا اور چہرے سے ملاحت ٹپکتی تھی۔ مزاج میں نفاست تھی خوش لباس اور خوش وضع تھے۔ گفتگو نہایت فصیح اور دلکش اور اخلاق ازبس وسیع تھا۔ علم و فن کو اپنا خاص کام سمجھتے تھے حیدرآباد سے مناصب قضا کے لئے طلب ہوئے مگر مشغلۂ علمی نے اجازت نہ دی اور صاف انکار کیا۔

مذہب میں بھی نہایت معتدل تھے۔ حنفی تھے مگر بندۂ تقلید بھی نہ تھے۔ محدث تھے مگر خود رائے

اور بالکل آزاد بھی نہ تھے ان کی مختصر سی لائف یہ ہے۔ ۲۷ ذی قعدہ روز شنبہ ۱۲۶۴ھ میں بمقام باندہ پیدا ہوئے۔ دسویں برس حفظِ قرآن سے فراغت حاصل کی سترہ برس کی عمر میں تمام درسی کتابیں ختم کرلیں۔ اکثر کتابیں اپنے والد مولوی عبدالحلیم صاحب سے پڑھیں۔ ریاضی وغیرہ مولوی نعمت اللہ صاحب سے حاصل کی۔ دو دفعہ حج کو گئے۔ ایک دفعہ چھٹ پن میں اور دوسری دفعہ جوانی میں اور عرب ہی میں علم حدیث شیخ جمال حنفی۔ شیخ محمد عرب شافعی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب نقشبندی دہلوی و سید احمد دحلان شافعی کی خدمت میں پڑھا۔ اکثر لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے مگر جاگیر کی ضرورت سے گاہ گاہ حیدرآباد کے سفر کا اور قیام کا بھی اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ بمقام حیدرآباد ہم کو بھی اُن کی ملاقات کی عزت حاصل ہوئی۔ کثرتِ مطالعہ اور محنت شاقہ کی وجہ سے دماغ کو صدمہ پہنچا اور صرع کے دور شروع ہوگئے۔

۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو اسی عارضہ میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حسن قبول کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوگی کہ ان کی نمازِ جنازہ تین بار پڑھی گئی اور ہر بار بہت بڑا مجمع ہوا۔

اینک از دستِ اجل جیب و جردش چاک است
پایۂ فن بفلک بردہ و خود در خاک است

و ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء

شمس العلماء مفتی میر عباس صاحب مرحوم

نہایت رنج و افسوس سے ہم نے جوبلی پے پر لکھنؤ میں مفتی میر عباس صاحب کے انتقال کی خبر دیکھی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمام ہندوستان میں یہی ایک شخص عربی علم و ادب کے جاننے والے تھے وہ بھی اس جہان سے کوچ کر گئے۔ پس عربی علم و ادب کا ہندوستان میں خاتمہ ہوا۔ افسوس صد ہزار افسوس۔

و ۱۸۸۹ء

پنڈت گوردت صاحب ایم اے

دنیا میں کوئی رنج ایسے شخص کی وفات سے زیادہ نہیں ہوسکتا جو ہونہار معلوم ہوتا ہو۔ اور جس سے عموماً انسانوں کی یا قوم کی یا فرقہ کی بھلائی اور ترقی کی توقع ہو۔ یہ رنج اس وقت اور زیادہ ہوجاتا ہے جب کہ وہ شخص اپنی ذات سے بھی ایسا لائق باعثِ افتخار قوم ہو۔

پنڈت گوردت ایم اے اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ وہ یورپین سینسر اور لٹریچر میں نہایت اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتے تھے۔ سنسکرت میں بہت مستعد پنڈت تھے۔ انگریزی میں بہت بڑے اسپیکر تھے۔ انکی انگریزی اسپیچیں اور لکچر تعجب خیز تھے اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو ایک مشہور اسپیکر ہوتے۔

وہ آریہ سماج لاہور کے نہایت معزز ممبر تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ انھیں نے تمام تعلقات سے قطع نظر کرکے آریہ سماج کی ترقی پر اپنے آپکو وقف کردیا تھا۔ نہایت معزز نوکریاں انکو ملتی تھیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیں اور آریہ سماج کی ترقی اپنی زندگی کا مقصد سمجھا یہی ایک ایسی بات ہے کہ انکی تمام خوبیوں کے لئے کافی ثبوت ہے۔

افسوس صد افسوس کہ ایسے شخص نے چھبیس برس کی عمر میں ۱۹ مارچ ۱۸۹۰ء کو مدقوق ہوکر انتقال کیا۔ ہزاروں آدمیوں نے ان پر ماتم کیا۔ ان کے جنازے کو جس قدر عزت دی جاسکتی تھی وہ دی مگر اس سے کیا ہوتا ہے جو نقصان قوم کو اور خصوصاً آریہ سماج کو اُنکے مرنے سے پہنچا اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

ہمارے نزدیک کسی قوم اور کسی مذہب کا آدمی ہو مگر کوئی کمال رکھتا ہو اُسکا مرنا انسانوں کیلئے مصیبت ہے جس کیلئے سب کو ماتم کرنا چاہیئے۔ الا کل شی ما خلا اللہ باطل۔

۱۹ مارچ ۱۸۹۰ء

وفات نواب صدیق حسن خاں بھوپال

ہم کو اخبار مفید عام آگرہ مطبوعہ بیسویں فروری سے معلوم ہوا کہ نواب صدیق حسن خاں کا روز چہار شنبہ ۲۸ر جمادی الثانی مطابق ۱۹ر فروری سنہ ۱۸۹۰ء کے ایک بجے رات کے انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۹ر جمادی الثانی روز پنجشنبہ مطابق ۲۰ر فروری کے ان کا جنازہ گیارہ بجے دن کے نہایت اژدہام سے اٹھایا گیا۔ امرائے ریاست اور فوج پیدل و سوار ہمراہ جنازہ تھے اور ہزاروں آدمی جنازہ کے ساتھ گئے۔

نواب صاحب مرحوم چھ مہینے سے بیمار تھے۔ اول بخار آیا پھر معدہ میں ورم آگیا۔ پھر ورم جگر ہوا۔ ہاتھ پاؤں پر ورم ظاہر ہوا اور اخیر کو استسقاء ہو گیا۔ بہت کچھ علاج ہوا مگر موت کا کچھ علاج نہ تھا۔ خدا ان کو بخشے۔ عمر قریباً پچپن چھپن برس کی ہو گی۔ ان کی تصانیف یا ان کے نام سے تالیف کی ہوئی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ دلی میں مدت تک انھوں نے پڑھا تھا۔ غیر مقلد تھے اور اس میں نہایت درجہ کا غلو تھا۔ کچھ شبہ نہیں کہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال کو اپنے عالم اور محدث شوہر کے انتقال کا بہت کچھ رنج ہو گا۔ مگر تقدیر سے کیا چارہ ہے۔

و ۱۹ر فروری سنہ ۱۸۹۰ء

ہائے! شمس العلماء مولوی محمد حسن مرحوم

صادقپوری پٹنوی

افسوس صد افسوس ہزار افسوس کہ مولوی محمد حسن صاحب نے تپ و لرزہ کی بیماری سے دوسری نومبر ۱۸۸۹ء کو ڈھائی بجے دن کے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کی بزرگی و تقدس اور اطاعت سنت سنیہ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس عمدگی اور بے ریائی و صفائی و سادگی سے تھی جس کا بیان طاقت بیان سے باہر ہے انکا طریقہ زندگی مباح وجائز بلکہ مسنون طریقہ پر معاملات دنیاوی کو برتنا ٹھیک سنت صحابہ کے طریق زندگی کا نمونہ دکھاتا تھا۔ یہ سب باتیں تو ان کی ذات کے لئے ہی مفید تھیں مگر جس طرح وہ اپنی ذات کے لیے مفید تھے اسی طرح قوم کے لئے بھی نہایت مفید تھے۔ قومی بھلائی کی ان سے بہت کچھ توقع تھی۔ سمجھدار شخص تھے اور سمجھتے تھے کہ قوم پر کیا مصیبت ہے اور اس کے واسطے کیا کرنا چاہیئے۔ قوم کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور روز و شب اس کی اصلاح کے درپے تھے مولانا تھے مگر کٹ ملّا نہ تھے۔ دونوں آنکھوں میں نور تھا۔ دین و دنیا دونوں کو دیکھتے تھے اور قوم کے دین و دنیا دونوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ تعصبات ناواجب کو قوم کے متعصب فرقوں سے توڑنے والے تھے۔ ریا سے دینداری دکھلانے، مباح باتوں کے ترک سے تقدس جتلانے کو نہایت برا سمجھتے تھے اور اس کے سخت مخالف تھے اور قوم سے اس کے چھوڑانے کے درپے تھے۔ محمود حسن اپنے بیٹے کو اور ہدایت اللہ اپنے بھتیجے کو واسطے تعلیم علوم انگریزی لندن بھیجا ہے۔ اعتقادات میں نہایت اعلیٰ درجہ کے وہابی بلکہ وہابیوں کا مرشدزادہ تھے۔ مگر جاہل وہابی نہ تھے۔ ٹھیک پورے اور سچے وہابی تھے جن کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ "ان لھم الجنۃ"، افسوس صد افسوس کہ ایسا شخص جہاں سے اٹھ گیا جس سے قوم کی صلاح و فلاح کی بہت کچھ توقع تھی۔

انھوں نے بالتخصیص دہابیوں کے اطفال کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ پٹنہ میں قائم کیا۔ تھا جس کا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل اسکول ہے۔ انگریزی تعلیم ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ قرآن وحدیث بھی لڑکوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ پٹنہ کے لوگ سر پیٹتے ہیں کہ کیسا شخص مرگیا۔ اسکول کے لوگ، اس کے طالب علم چشم نم ہیں کہ ان کے ساتھ اسکول کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ہم بھی علی گڑھ میں بیٹھے انکو اور ان کے اسکول کو رو رہے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے بعد محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کا بھی یہی حال ہوتا ہے مگر آرزو یہ ہے کہ خدا ایسا نہ کرے۔ آمین

و ۲ر نومبر ۱۸۸۹ء

وفات مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم

ہزار افسوس کہ مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کا جو علی گڑھ میں نہایت بزرگ اور بے مثل شخص تھے چوتھی مئی سنہ ۱۸۹۴ء روزِ جمعہ کو انتقال ہو گیا۔ وہ چند روز سے بیمار تھے بخار ہوا تھا پھر خوانق اور ورم جگر ہو گیا تھا۔ نہایت ضعیف و لاغر ہو گئے تھے تمام شہر کے مقتدا اور عیدگاہ اور جامع مسجد قدیم کے امام تھے۔ علی گڑھ میں امراضِ لاحقہ میں کچھ افاقہ نہیں ہوا اس لیے ان کو دہلی لے گئے تاکہ حکیم عبدالمجید خاں صاحب کا علاج کیا جاوے مگر وقتِ موعود جو ہر شخص کو آنے والا ہے آ پہنچا اور جس دن دہلی پہنچے اسی دن سہ پہر کو انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی صاحب مرحوم نہایت بزرگ ذی علم و محدث تھے ان کی طرف مرجعِ خلایق تھا۔ ان کی وفات سے علیگڑھ علم سے خالی ہو گیا ان کا جنازہ دہلی سے علی گڑھ لایا گیا پانچویں مئی کو عیدگاہ میں نمازِ جنازہ ہوئی۔ نہایت کثرت سے لوگ ان کے جنازہ کی نماز میں شامل تھے۔ سیکڑوں آدمی روتے تھے اور چشم نم تھے مگر خدا کی مرضی سے کسی کو کچھ چارہ نہ تھا آخیر کو سب نے انکو ایک باغ میں دفن کر دیا اور تمام یگانہ و بیگانہ و معتقدین، جاں نثاران کو تنہا زمین پر چھوڑ کر چلے آئے اور انکو ان کے خدا کے سپرد کر دیا۔

کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

و ۴ مئی سنہ ۱۸۹۴ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی مرحوم

افسوس ہزار افسوس صد ہزار افسوس کہ ۱۵ر جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتہ کی بیماری میں انتقال کیا۔ اُنکا خط خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مورخہ ۹ر جون مقام حیدر آباد سے ہمارے پاس آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تین ہفتہ سے بیمار ہوں ڈیڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جاوے کلوفارم کا عمل کرکے کاٹا اور بعد میں بھی پھر دوبارہ کلوفارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں۔ کھانا پینا نہیں چلنا پھرنا موقوف، بگاب زخم بھرتا چلا آتا ہے اور ارادہ ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بمبئی جاؤں۔

اس کے بعد ۱۲ر جون کا بمبئی سے انھیں کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آگیا۔

افسوس کہ ۱۵ر تاریخ کو جب ہم بعض کا غذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے اسی وقت انھوں نے بمبئی میں انتقال کیا تھا۔

مولوی چراغ علی ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے۔ حیدر آباد میں سالار جنگ اعظم نے ان کو بلایا تھا۔ اس زمانہ سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدر آباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا ان کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلہ کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدر آباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے فارسی نہایت عمدہ جانتے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی زبان میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن و گریک بقدر کار روائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے انگریزی زبان میں بھی

انھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے ہمارے بہت بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی نہایت افسوس و رنج کے لائق ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا وہ ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں ہے کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔ سید محمد محمود نے ان کی تاریخ وفات میں یہ فقرہ کہا:

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد۔

سنہ ۱۸۹۵ء

و ۱۵ جون سنہ ۱۸۹۵ء

حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

افسوس ہے کہ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی نے ایک سو سات برس کی عمر میں ۲۳ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے زہد وکمالاتِ باطنی ایسے مشہور تھے جن کے اعادہ کی ہم کو حاجت نہیں۔ شاہ صاحب نقشبندی مجددی اور حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ کی تربیت اور شاہ محمد آفاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ تقدیس پر پہنچے تھے۔ نقشبندیہ مجددیہ کے خانوادہ میں ہمکو معلوم نہیں ہے کہ اس زمانے میں اُن سے زیادہ مقدس کوئی شخص تھا۔ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس زمانے میں سوائے ہمارے کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہ اور شاہ محمد آفاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دیکھا ہو ہم کو تو یہ فخر ہے کہ ہم نے حضرت شاہ غلام علی صاحب کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ان روحانی تعلقات کے سبب جو ہمارے خاندان کو جناب ممدوح سے تھے ہم جناب ممدوح کو دادا حضرت کہتے تھے اور وہ بھی ہم سے پدرانہ محبت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ غلام علی صاحب اکثر فرماتے تھے کہ خدا نے مجھ کو تو زن وفرزند سے آزاد رکھا ہے مگر سید متقی کی اولاد کی مثل اپنی اولاد کے محبت ڈال دی ہے۔ ان کی اولاد کی ذرا سی تکلیف مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔ پس جن لوگوں نے حضرت شاہ غلام علی صاحب اور شاہ محمد آفاق صاحب کو دیکھا تھا اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ہم کو ان سے ایک طبعی

محبت اور عقیدت تھی ایسے بزرگوں کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا جس قدر ہم کو افسوس ہو سکتا ہے اس قدر کسی کو نہیں ہو سکتا۔ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب ہمارے دادا حضرت شاہ غلام علی صاحب اور شاہ محمد آفاق صاحب کی ایک نشانی تھے جو دنیا سے چل بسے۔ قدس اللہ روحہ اللہ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۱۸۹۵ء

اہلِ علم اور فن

ہنری فرڈیننڈ بلوک مین کی وفات

ہم نہایت تاسف سے تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲ر جولائی کو مسٹر بلوکمین پرنسپل مدرسہ کلکتہ آنے اس جہانِ ناپائیدار سے دارالبقاء کو رحلت کی۔

علم و ہنر کا ہے ہے کیا خاک ہووے چرچا
جب لائقوں کے خوں کا یہ دھر ہو پیاسا

آج ہندوستان میں تکمیل تحصیل علوم عربی و عبرانی میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ راست بازی اور صفائی طبیعت کی یہ کیفیت تھی کہ جس سے ان کو سابقہ ہوا وہ انکا مداح اور معترف ہوگیا۔ ان کے انتقال سے مدرسہ کلکتہ کو اور ایشیاٹک سوسائٹی کو نہایت صدمہ پہنچا ہے۔ اخبار ایشیاٹک سوسائٹی میں یہ بزرگ اکثر مضامین عمدہ درج کیا کرتے تھے۔ ۱۲ر جولائی کو انکی تجہیز و تکفین کی گئی۔ بے شمار انگریز اور مسلمان ان کی نعش کے ہمراہ نوحہ کناں و سینہ زناں و خاک برسر افشاں چلے جاتے تھے۔ شاہزادہ بشیرالدین، مولوی عبداللطیف خاں صاحب بہادر سید امیر حسن، مولوی عبدالحق وغیرہم اور کوئی دو سو طلبا، مدرسہ بھی اُن کے جنازے کے ہمراہ تھے۔ یہ اعزاز اور کسی کو میسر نہیں ہوا۔

و ۱۲ر جولائی ۱۸۷۸ء

نواب ضیاء الدّین خاں رحمۃ اللہ

ہم نہایت افسوس کے ساتھ اس خبر کو لکھتے ہیں کہ جناب مغفرت مآب نواب ضیاء الدین خاں نے ۲۷ر جون ۱۸۸۵ء روز شنبہ مطابق ۱۳ر رمضان رواں کو شہر دہلی میں جو اِن کا مولد و وطن تھا اس جہاں گذراں سے ملک جاوِداں کو انتقال فرمایا رحمۃ اللہ و رضی عنہ ..

نواب مرحوم ترک نژاد تھے مگر چند پُشتوں سے سلطنت دہلی زاد بوم تھی لوہارو ان کے جد اعلیٰ کی جاگیر تھی اور ابھی تک ان کے بھتیجے نواب علاء الدین خاں مرحوم کے بیٹے رئیس لوہارو ہیں۔

نواب مرحوم نواب شمس الدین خاں شہید کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولوی حاجی یاد علی محدث مرحوم کے عربی میں شاگرد تھے اور نواب مرحوم کی عربیت بہت اچھی تھی اور اکثر فنون میں اچھی دستگاہ تھی خصوصًا علم تواریخ میں نہایت کمال تھا۔

نواب مرحوم کے نہایت معمر ہونے اور کُلّ من علیھا فان پر اذعان کرنے سے ہم کو ان کے انتقال پر زیادہ مغموم ہونے کا حق نہیں ہے لیکن جب ہم ان کے علم اور فضل اور اخلاق اور اشفاق عام پر نظر کرتے ہیں تو بیشک آنکھوں کو ان کے لئے رونے پر معذور پاتے ہیں اور بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

و ۲۷ر جون ۱۸۸۵ء

حکیم محمود خاںؒ صاحب مرحوم

افسوس ہزار افسوس کہ جناب حکیم محمود خاں صاحب نے ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۹۲ء کو بوقتِ شب جو اہلِ اسلام کے حساب کے مطابق شبِ دوشنبہ تھی اس جہان سے چوہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور درگاہ سید حسن رسول نما میں مدفون ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے انتقال کا نہ صرف اہلِ دہلی کو ماتم ہے بلکہ تمام اطراف ہندوستان کے لوگوں کو بھی جو دور دور ملکوں سے بیماری کے ہاتھ سے جاں بلب ہوکر جان بخشوانے آتے تھے۔ کیا ان کا رنج صرف زندوں ہی کو ہے، دہلی کے بڑے بڑے نامور اور مشہور عالی درجہ لوگوں کی روحیں بھی اس غم میں رو رہی ہوں گی کہ دلی کے اہلِ کمال کا نام آج دنیا سے مٹ گیا۔ صرف حکیم محمود خاں کی ایک ذات تھی جو دلی کے اہلِ کمال کو یاد دلاتی تھی وہ بھی نہ رہی۔ دلی کو اب دلی نہ کہنا چاہیئے نہ دہلی بلکہ اس کا بہت پرانا نام دہلو لینا چاہیئے جس طرح وہ اہلِ کمال سے قطعاً خالی ہوگئی ہے اس طرح اس کا نام بھی نقاط سے خالی رہے۔ حرفوں پر نقطے ستارے ہوتے ہیں اس کے نام سے ظاہر ہو کہ اس کے تمام ستارے جھڑ گئے۔

حکیم محمود خاں مرحوم ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی وضع کے ایک ہی شخص تھے۔ دوستوں کے ساتھ نہایت دوستی سے پیش آتے تھے انکی سیر چشمی بے نظیر تھی ایک مقولہ مشہور ہے کہ:

طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی

مگر ان کا کمال یہ تھا کہ خود ان کا دل طمع سے خالی تھا اپنی وضعداری کے سامنے ہزاروں روپوں کو جنھیں کوڑی کے برابر بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور ایک غریب سے غریب بیمار آدمی

کے گھر پر جانے میں کچھ عار نہ کرتے تھے دہلی میں ان سے گویا ایک چشمۂ آبِ حیات جاری تھا جس کو تقدیر نے سکھا دیا جو کمالِ بے نفسی اور نہایت قوتِ ایمانی انھوں نے زمانۂ غدر میں برتی اور اس مشہور حدیث ۔ الایمان لمن لا امانۃ لہ کے مضمون منفی کو مثبت کر دکھایا اور اپنے تئیں ایمانِ کامل کا پورا مصداق بنایا۔ وہ تو ایک بے نظیر مثال ہے۔ بلاشبہ وہ اس شعر کے مصداق تھے۔

درویش صفت باش وکلاہ ترتری دار۔

بہرحال جو کچھ وہ تھے اب تو پیوندِ خاک ہیں خدا مغفرت کرے اور ان کی اولاد کو وہی درجہ اور عزت نصیب کرے جو ان کے بزرگوں کو پشت در پشت تھی۔

افسوس ہے کہ دہلی اہلِ کمال سے بالکل خالی ہوگئی۔ کسی فن کا صاحب کمال دلی میں نظر نہیں آتا محدثین میں اب جو کچھ گنوں مولانا مولوی سید نذیر حسین دکھائی دیتے ہیں۔ شاعروں میں اگر دیکھو تو داغ معلوم پڑتے ہیں اور اگر حقیقت پوچھو تو وہ بھی زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ:

کبرنی موت الکبریٰ

یہ اخیر مرثیہ ہے نہ صرف حکیم محمود خاں کا بلکہ دہلی کا۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلالِ والاکرام۔

مگر برائے کہ بلی برائے خود

لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار۔

و ۲۴ جنوری ۱۸۹۲ء

طلبائے کالج

مولوی محمد ایوب مرحوم

نہایت افسوس ہے کہ مولوی محمد ایوب خلف اکبر شمس العلماء مولوی محمد عبدالرؤف رئیسِ پٹنہ کو مرضِ لاحقہ سے نجات نہ ہوئی اور چودھویں جنوری کو ۲۲ برس کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ مرحوم نہایت نیک سعادت مند جوان تھا اور عربی و انگریزی میں بہت لائق تھا۔ سول سروس کے امتحان کے لئے لندن جانے کی بالکل تیاری ہو چکی تھی مگر تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔

مرحوم کی بیماری اور خان بہادر قاضی سید رضا حسین مرحوم کی علالت کی وجہ سے اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پٹنہ میں ملتوی ہو گیا تھا اور امید تھی کہ آئندہ سال میں نہایت خوبی سے وہاں اجلاس ہوگا مگر افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں کے انتقال سے وہ سب خیالات معدوم ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

و ۱۴ جنوری ۱۸۹۲ء

افسوس صد افسوس

محمد زبیر خاں فرزند حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی نے دوسری جولائی کو بمقام الموڑہ جہاں بہ غرض تبدیل آب و ہوا گئے ہوئے تھے چند مہینے بیمار رہ کر انتقال کیا ان کے ماں باپ کو جو صدمہ ہوا ہے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر ہم کو بھی کچھ کم رنج و افسوس نہیں ہوا۔

دوستوں کی اولاد کے سبب جن سے اگرچہ کچھ رشتہ داری نہیں تھی مگر دوستی پیوند خون کی مانند ہو گئی تھی ہم کو یہ دوسرا صدمہ ہے بیس اکیس برس ہوئے کہ مولوی سید ہدی علی نے اپنے اکلوتے بیٹے محمد حسن مرحوم کو تعلیم و تربیت کے لئے ہمارے سپرد کر دیا تھا وہ مثل فرزندوں کے ہمارے پاس رہتا تھا اور ایسے عمدہ طور پر تعلیم و تربیت پا رہا تھا جس سے بہت کچھ امیدیں تھیں جب کہ وہ نہایت عمدہ طریقے سے ترقی کر رہا تھا اور دور کی امیدیں بہت قریب آ گئی تھیں اجل آ پہنچی اور تمام امیدوں کو تہ خاک کر دیا۔ اور مدت تک اس کا رنج رہا اور ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ کسی دوست کی اولاد کی تعلیم و تربیت کو اس طرح اپنے ذمہ نہ لیں گے۔

ایک مدت کے بعد جب کہ وہ غم بھی غلط ہو گیا تھا اور حاجی محمد اسمٰعیل خاں کی محبت نے رشتہ مندی سے زیادہ الفت پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے فرزند محمد زبیر خاں مرحوم کی تعلیم و تربیت ہمارے سپرد کر دی تھی تمام سامان اسکی تعلیم و تربیت کا ہندوستان سے کر انگلستان تک ہم نے درست کیا تھا اور ایک ایک دن گنتے تھے کہ وہ ہماری ان کوششوں سے فائدہ اٹھاوے اور ہم کو اس کی سعادتمندی و ترقی تعلیم دیکھکر

خوشی ہو۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا بلکہ یہ منظور تھا کہ نہایت عمدہ و خوبصورت مثل دلہن کے آراستہ کمرہ بورڈنگ ہوس کا آباد نہ رہے ویران ہو جائے۔ ہمارے جو خیالات اس کی نسبت ہیں وہ پورے نہ ہونے پاویں۔ اجل کو بھیج دیا اور اپنے پاس بلا لیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

ہزاروں امیدوں اور خوشیوں کے دفعتاً ٹوٹ جانے سے جو رنج اور دل کو صدمہ ہوتا ہے وہ اس کا دل جانتا ہے جس پر گزرتا ہے مگر بجز رضا بہ قضا کچھ چارہ نہیں ہوتا ابھی سید محمود علی بی اے کے انتقال سے جو رنج ہمارے دل پر پڑا وہ بھولا نہ تھا کہ خدا نے محمد زبیر خاں مرحوم کا رنج اس پر زیادہ کر دیا۔ خیر جو کچھ رنج ہمارے دل پر گذرا وہ تو گذرا مگر سب سے زیادہ رنج کی بات ہے کہ ایسے واقعات قوم کے ادبار کا ثبوت دیتے جاتے ہیں اور قومی ترقی و بہبودی سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ جو ہونہار معلوم ہوتے ہیں وہی چل بستے ہیں سچ ہے کہ تقدیر کے ساتھ لڑائی نہیں ہو سکتی ہار کر یہ کہنا پڑتا ہے رضینا برضاء اللہ۔

و ۲ر جولائی ۱۸۹۲ء

خلیفہ سیّد مہدی حسن مرحوم

مہدی حسن زدار فنا شد ہزار حیف
صد داغ تازہ بر جگر دوستاں نہاد

افسوس صد افسوس کہ سولہویں فروری کو پانچ بجے شام کے خلیفہ سید مہدی حسن مرحوم اکلوتے بیٹے جناب وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ نے انتقال کیا اور داغ جدائی ابدی اپنے بزرگ باپ کو اور اپنے باپ کے دوستوں کو دیا۔

مہدی حسن مرحوم جوان با اخلاق خوش صورت و خوش سیرت ہونہار باوقار تھے ان کے دوستوں کو ان سے محبت تھی مگر افسوس ہے کہ کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ یہ رشتۂ محبت اور یہ رشتۂ پدری و فرزندی بہت جلد ٹوٹنے والا ہے۔ ان کے دوستوں کو اس حادثے سے جو رنج والم ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ پس ہم خیال نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ سے اُن کے پدرِ بزرگوار پر کیا کچھ گذرا ہو گا مگر مشیتِ ایزدی سے کسی کو چارہ نہیں ہے جب انسان بے بس ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ بجز صبر کے اور کچھ چارہ نہیں ہے مگر خدا صبر بھی دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین۔

۱۶ر فروری ۱۸۹۳ء

خلیفہ سیّد عنایت حُسین مرحوم

رنج و مصیبت و غم و الم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مگر جب وہ حد سے گزر جاوے تو کیا بیان ہو سکے۔

صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مگر جب حد سے گزر جاوے تو کیونکر ہو سکے ایک نوجوان خوش رو، خوش خو، نیک سیرت، پاکیزہ خصلت لایق قابل جس کے ساتھ باپ، چچا، بھائی بندسب کی ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں دفعتًا دنیا سے گزر جائے تمام آرزوئیں خاک میں مل جاویں دو ا می جدائی کا داغ لازوال سب کے دلوں پر جاوے۔ تو یہ مصیبت کس طرح برداشت ہو سکے۔

افسوس صد افسوس ہزار افسوس کہ خلیفہ سید عنایت حُسین فرزند مشیر الدولہ ممتاز الملک خلیفہ سید محمد حسین خاں بہادر نے جن کی ابھی شادی کتخدائی یکم مارچ روز پنجشنبہ کو بمقام میرٹھ ہوئی تھی شادی کے بائیسویں دن یعنی ۲۲ مارچ کو بمقام پٹیالہ انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ سامانِ شادی ابھی اُٹھنے ہی نہیں پایا تھا کہ خود دنیا سے اُٹھ گئے ماتم نوشاہ ماتم نوجواں جن لفظوں سے چاہو اسے تعبیر کرو وہ خود تو چل بسے بتعبیر ہی تعبیر باقی رہ گئی کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع حادثہ سے اس مرحوم کے باپ اور چچا پر جنکی ہزاروں امیدیں اس مرحوم کے ساتھ تھیں کیا گذری اون کو اولاً بمقام میرٹھ بخار آیا اور نزلہ کی شدت ہوئی۔ نمونیا تک نوبت پہنچی اور اسی مرض میں انتقال ہوا۔

خلیفہ عنایت حسین ہمارے کالج کے ان طالب علموں میں سے تھے جن پر کالج فخر کر سکتا تھا۔ وہ مدتِ دراز تک بورڈنگ ہوس میں رہے ہم ان کو اپنا عزیز لخت جگر

سمجھتے تھے۔ تمام طالب علم جو ان کے ساتھ کے تھے انکو مثل بھائی کے جانتے تھے۔ اتفاقاً اُن دنوں میں دو ایک طالب علم جو ان کے ساتھ کے پڑھے ہوئے تھے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ انکو اُن کے انتقال کی خبر سُن کر ایسا رنج و صدمہ ہوا ہے کہ بیان نہیں اور اس سے زیادہ اس صدمہ کا کیا بیان ہو سکتا ہے کہ "گویند جواں مرد"، والحق ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور بجز اسکے کہ بار بار کہیں انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور کیا چارہ ہے۔

و ۲۲ مارچ ۱۸۹۴ء

احباب و معاصرین

حافظ عبدالرحمن صاحب مرحوم

افسوس ہے کہ بارہویں مارچ ۱۸۸۶ء روز جمعہ کو آٹھ بجے دن کے حافظ عبدالرحمن صاحب کا جو مدت سے امراض متعددہ میں مبتلا تھے انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حافظ صاحب نہایت نیک و بزرگ باخدا تھے قرآن مجید ایسا عمدہ یاد تھا کہ متعدد رمضانوں میں کل قرآن مجید ایک شب میں ختم کیا ہے۔ علم طب میں بھی بہت خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ علی گڑھ کے غریب غرباء کا للہ علاج کرتے تھے۔ شاعر و ناشر بھی تھے۔ حیرت تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان اور مثنویاں اور انشاء فارسی انکی یادگار باقی ہیں۔ بہت برسوں تک ان کو سیئنٹیفک سوسیٹی علی گڑھ سے تعلق تھا ان کی نیکی و خوبی کو ہر کوئی یاد کرتا ہے۔ ۱۸۴۶ء سے جس کو چالیس برس ہوئے سید احمد خاں کے ساتھ بطور عزیز رشتہ داروں کے رہتے تھے۔ اس عرصۂ دراز میں کبھی ایک دن ایسا امر پیش نہیں آیا جو دونوں میں سے کسی کے ملال کا باعث ہوا ہو۔ اس سے حافظ صاحب مرحوم کی خوبی اور نیک مزاجی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ سید احمد خاں کو ان کے انتقال کا بہت رنج ہوا ہے کیونکہ آج ان کا چالیس برس کا دوست دنیا سے اٹھ گیا۔

۱۲ مارچ ۱۸۸۶ء

ہائے منشی محمدؐ رمضان مرحوم

اور

وائے مولوی مرزا فتح محمدؐ بیگ مرحوم

ابھی ہمارے دل سے منشی محمد رمضان مرحوم کے مرنے کا غم بھولا نہ تھا کہ مولوی مرزا فتح محمد بیگ صاحب کے انتقال کی خبر نے ہم کو زیادہ تر رنجیدہ اور افسردہ کر دیا۔ منشی محمد رمضان جوان صالح خوش خوُدلی دوست اور نہایت محبت کے آدمی تھے جس وقت ہم ان کے مرنے کا خیال کرتے ہیں پنجاب ہماری آنکھوں میں اندھیرا معلوم ہوتا ہے۔ مرزا فتح محمد بیگ صاحب میں علاوہ محبت اور تمام خوبیوں کے قومی ہمدردی کا بھی زاید از حد خیال تھا اور جس قدر اُن سے ہو سکتا تھا کرتے رہتے تھے اور دن رات اسی میں لگے رہتے تھے ایسے لوگوں کے انتقال سے تمام قوم کو ماتم کرنا زیبا ہے جو کہ مسلمانوں کا ادبار ہے، اس لئے ان کی قوم میں سے ایسے لوگ جن سے قوم کی بھلائی کی کچھ توقع ہو سکتی ہے دُنیا سے اُٹھتے جاتے ہیں اگر ہمارا جانا پنجاب ہوا جس کا احتمال ہے کہ اسی سال میں ہو تو ان دوستوں کے نہ ہونے سے جس قدر رنج و صدمہ ہمارے دل پر ہوگا اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ بہرحال خدا ان پر رحم کرے اور ہماری آواز واما بکم ان الاعقون ان تک پہنچا دے۔ درحقیقت سب کو یہی رستہ چلنا ہے اور آگے پیچھے ہم سب اسی منزل پر پہنچنے والے ہیں۔ آخر کو ہم اپنے باقی ماندہ دوستوں کو جن سے پنجاب کو روشنی ہے اور ہم کو تقویت ہے دعا دیتے ہیں کہ خدا ان کو صحیح و تندرست زندہ سلامت خوش و خرم رکھے اور جو اس دنیا سے کوچ کر گئے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۱۸۸۸ء

سید میر ظہور حسین مرحوم

وکیل ہائی کورٹ الہ آباد، رئیس مراد آباد

بلا شبہ دنیا میں چل چلاؤ کا تار لگا ہوا ہے آج اس نے کوچ کیا کل ہم کو کوچ کرنا ہے آج ہم کسی کے لئے روئے ہیں کل کوئی ہمارے لئے روئے گا بے شک خوش نصیب وہی ہیں جن کے بعد ان کو کوئی روئے۔ افسوس صد افسوس کہ سید میر ظہور حسین صاحب کا چھٹی فروری روز جمعہ کو بارہ بجے شب کے دفعتاً انتقال ہو گیا۔ کسی قسم کی علالت کی خبر نہیں سنی گئی اور اس لئے ان کے دوستوں کو دفعتاً انتقال کی خبر سننے سے بے انتہا صدمہ ہوا ہے۔

سید میر ظہور حسین نیکی اور اخلاق اور محبت اور دوستی کی مجسم صورت تھے۔ خدا ترسی کوٹ کوٹ کے خدا نے ان کے دل میں بھری تھی نہایت رقیق القلب تھے۔ خیر و خیرات خصوصاً مخفی طور پر کرنے کی ان کی عادت بلکہ جبلت تھی۔ مہمان نوازی میں اپنے جد بزرگوار ابراہیم علیہ السلام کے پیرو تھے کوئی چیز ان کو مہمان نوازی سے زیادہ خوش کرنے والی نہ تھی ان کے دوستوں اور ملاقاتیوں میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو کسی نہ کسی طرح سے ان کا ممنونِ احسان نہ ہو۔

سید میر ظہور حسین نے اپنی زندگی نہایت عزت اور فراخ حوصلگی خوش حالی اور فیاضی اور نیکی سے بسر کی۔ ہندو مسلمان سب ان کے دوست اور ثنا خواں تھے ان سب دوستوں کو چھوڑ کر دنیا سے کوچ کیا خدا ان کو غریقِ رحمت کرے بلا شبہ انھوں نے اپنی زندگی اور موت کو اس شعر کے مصداق کر دکھایا۔

زانگر نہ بزمی کہ چوں بمیری
گویند کہ شمع بود گل شد

---

۶ فروری ۱۸۹۱ء

خانؔ بہادر قاضی سیّد رضا حسین مرحوم

یہ بات سُن کر کہ قاضی سید رضا حسین رئیسِ پٹنہ کا انتقال ہو گیا کونسا دل ہے جس کو سخت اور نہایت سخت صدمہ نہ پہونچا ہوگا۔ مرنا تو سب کے لئے ہے مگر ایسے شخص کا مرنا جو اپنی خوبیوں، اخلاق، محبت، نیکی، نیک دلی، مروّت، دوستی، دوستی کے برتاؤ میں قوم میں یکہ، قوم کی عزّت قوم کے افتخار کا باعث ہو قوم کے رفاہ و فلاح میں ہمہ تن مصروف ہو قوم کی تعلیم میں روپیہ سے، محنت سے، ہر وقت موجود ہو اس کا مرنا صرف اسی کا مرنا نہیں ہے بلکہ قوم کا مرنا ہے جہاں ہماری قوم پر صدہا قسم کی بدبختیاں ہیں انھیں میں سے ایک بدبختی قاضی صاحب مرحوم کا انتقال کرنا ہے۔

ان کا خوبصورت نورانی چہرہ اُن کی دلچسپ اور محبت آمیز باتیں ان کی دلربا ہنسی ان کے ملنے والوں کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

رئیسانِ پٹنہ ان کی محبت و نیک دلی سے اُن کے گرویدہ تھے ان کا وجود پٹنہ میں غنیمت تھا۔ ہر شخص ان کو ادب کی نگاہ سے دیکھتا تھا ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا تھا ان کی مجلس میں علمی اور روحانی پاکیزگی کی باتوں کا چرچا رہتا تھا ان کے انتقال سے پٹنہ ان سب باتوں سے محروم ہو گیا افسوس صد افسوس کہ قوم میں کوئی نظر نہیں آتا جو اُن کا جانشین خیال کیا جا سکے۔

قاضی صاحب پر ایک زمانہ گذرا جس میں ان کو زہد و مجاہدہ کا بہت بڑا خیال ہو گیا تھا۔ گوشۂ تنہائی اختیار کیا تھا۔ اپنے حجرہ میں سے جہاں وہ عبادت میں مصروف رہتے تھے بہت کم نکلتے تھے۔ دنیا اور دنیا سے نفور تھی۔ دن رات بجز شغل و اشغالِ قلبی تلاوتِ قرآن مجید مراقبہ کے اور کچھ کام نہ تھا اور یہ زمانہ ان کی جوانی کا تھا۔ ایک مدت تک ان کا یہی حال رہا پھر سوچے کہ یہ سب کچھ تو میں اپنے لئے کرتا ہوں۔ ابنائے جنس کا بھی مجھ پر کچھ فرض ہے

اور اوروں کے لئے بھی مجھ کو کچھ کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے حجرہ سے قدم باہر نکالا اور ابنائے جنس اور اپنی قوم کی رفاہ و فلاح اور دوستوں کی حاجت روائی خلق خدا کی خدمت میں توجہ فرمائی۔ اپنی جائیداد مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کردی اور جب تک زندہ رہے طالب علموں کو اسکالرشپوں اور وظیفوں کے دینے اور ہر طرح سے امداد کرنے سے ان کی ترقی تعلیم میں مدد کی۔ متعدد مسلمان طالب علم صرف ان کی مدد سے بی اے اور ایم اے کی ڈگری تک پہنچے ہیں۔

سب سے آخیر جو انھوں نے قومی بھلائی کا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن حیدر آباد گیا تھا اس میں شریک تھے۔ ان کی شرکت کی برکت سے ڈیپوٹیشن کو نہایت کامیابی ہوئی جب ڈیپوٹیشن نے مراجعت کی تو انھوں نے پونا اور بمبئی کے دیکھنے کا ارادہ کیا اور ڈیپوٹیشن سے علیحدہ ہوکر پونا تشریف لے گئے۔ پونا کی آب و ہوا طبیعت کے موافق نہیں ہوئی اور طبیعت علیل ہوگئی۔ پونا سے بمبئی گئے وہاں کچھ زیادہ علیل ہوگئے لاچار پٹنہ کو مراجعت کی بیماری زیادہ ہوگئی تھی اور جگر میں زیادہ نقصان آگیا تھا ہر چند معالجات ہوئے مگر قضا مبرم تھی اس نے نہ چھوڑا اور ۲۶ دسمبر ۱۸۹۱ء روز شنبہ، ۱۰ بجے دن کے انتقال کیا۔ خود تشریف لے گئے اور داغ جدائی احباب کیلئے اور حسرت افسوس قوم کے لئے چھوڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۲۶ دسمبر ۱۸۹۱ء

خان بہادر مولوی محمد کریم مرحوم

موت کوئی چیز تعجب کی نہیں ہے مگر بعض دفعہ وہ اس طرح آجاتی ہے جس سے لوگوں کو تعجب حیرت افسوس و عبرت ہوتی ہے۔

مولوی محمد کریم صاحب خاصے بھلے چنگے صحیح و تندرست تھے بریلی کو ان کی تبدیلی کی خبر گرم تھی وہ بھی بریلی کو پسند کرتے تھے اور منتظر حکم تھے۔ ۳۱ دسمبر روز پنجشنبہ کو ان کی تبدیلی کا تار آیا کہ چوتھی جنوری تک بریلی پہنچ کر کام سنبھال لیں وہ تیار بیٹھے تھے سب اسباب باندھ چکے تھے انھوں نے اسباب روانہ کر دیا اور دوسری جنوری کی رات کو جو چار بجے ٹرین جاتی ہے اس میں روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔

جمع کی رات کو کنور محمد عبدالغفور خاں صاحب کے ہاں اُن کی دعوت تھی وہاں گئے سب دوستوں سے ہنستے بولتے رہے کھانا کھایا دوسرے دن روز شنبہ دوپہر کو مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب نے کلب میں دعوت کی وہاں بھی بخوبی شریک ہوئے کھاتے پیتے رہے۔ اسی دن چار بجے سید احمد خاں اُن سے ملنے و رخصت ہونے کو گئے بخوبی صحیح و تندرست تھے اور ہر قسم کی باتیں کرتے رہے اسی شام کو کنور محمد فیاض علی خاں رئیس پہاسو کے ہاں دعوت تھی اس میں شریک ہوئے ساڑھے گیارہ بجے رات کے سب دوستوں سے رخصت ہو کر اسٹیشن پر گئے وہاں ویٹنگ روم میں سو رہے اس ارادہ سے کہ چار بجے کی ٹرین جو روہیلکھنڈ کو جاتی ہے اس میں سوار ہو کر بریلی روانہ ہوں۔

چار بجے کے قریب خود اُٹھے نوکروں کو جگایا ٹکٹ لیا جب ریل چلنے کا وقت آیا وہاں آئے۔ ریل کی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر گھسے اور بہت جلد نکل آئے اور کہا میرا دل گھبراتا ہے اور گرمی معلوم ہوتی ہے چغہ اتار پھینک دیا ٹوپی اتار ڈالی، گھبراہٹ و بے قراری زیادہ معلوم ہوئی اور پلیٹ فارم ہی پر بیٹھ گئے تو نوکروں نے یہ حال دیکھ کر اسباب اتار لیا اور پلیٹ فارم ہی پر ایک

طرف گدا بچھایا اُس پر لیٹے بیقراری سے اِدھر اُدھر دو ایک کروٹیں بدلیں اور کہتے رہے کہ خدا رحم کرے اللہ رحم کر بس خاموش ہو گئے اور چند منٹ میں روح پرواز کر گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کو کبھی کبھی سینہ و حوالی قلب میں زیجی درد محسوس ہوتا تھا شنبہ کی صبح کو وہ سید احمد خاں پاس ملنے کو آئے اور دفعتاً سینہ میں قلب کے قریب چمک درد کی محسوس ہوئی تھی چڑھتے بینیے اور ڈکار آنے سے رفع ہو گئی تھی کچھ شبہ نہیں کہ انھوں نے قلب کی بیماری سے دفعتاً انتقال کیا۔

اس قسم کے واقعات بلا شبہ نہایت عبرت انگیز ہیں زندگی موہوم کی حقیقت اور موت کی حقیقت کس طرح عیاں ہو جاتی ہے مگر انسان ایسا غافل ہے کہ کبھی اس کو مرنے کا خیال نہیں آتا اگر موت کا خیال آتا ہے تو دوسروں کی موت کا نہ اپنی موت کا۔

مولوی محمد کریم نہایت نیک دل صاف باطن صاف دل تمام خوبیوں کے مجمع تھے کسی سے ان کے دل میں کدورت یا رنج رہنے کی جگہ نہ تھی درویشوں سے انس رکھتے تھے کبھی کبھی مثنوی مولوی روم کے اشعار نہایت خوبی سے پڑھتے تھے اور ایک جوش اُن کے دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔

دو دفع وہ اس ضلع میں ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے اور طویل زمانہ تک یہاں رہے ضلع کے تمام رئیسوں سے دوستانہ راہ و رسم تھی تمام رئیس ان کے اخلاق کے گرویدہ تھے ہر ایک شخص ان کو نہایت ادب و عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جو عزت اور اعتبار اور حکام کا اعتماد انھوں نے اپنے عہدے کے کاموں میں حاصل کیا تھا بہت کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

دوستوں کے ساتھ نہایت دوستی سے ملتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ چشم مروت رکھتے تھے قوم کی بھلائی کا دل میں خیال تھا ابتدا سے مدرستہ العلوم مسلمانان کے کاموں میں شریک تھے اور وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتے تھے مگر جب شب مابین شنبہ و یکشنبہ کو سوا چار بجے دفعتاً دیکھا تو سب کا خاتمہ تھا۔

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ان کے انتقال سے تمام شہر کے لوگوں چھوٹوں اور بڑوں، ہندو مسلمان کو سب کو برابر کا رنج تھا ان کے جنازہ کے ساتھ نہایت کثرت سے لوگ تھے اُن کے رشتہ مندوں میں سے یہاں کوئی موجود نہ تھا مولوی سید زین العابدین خاں صاحب ان کے قریب الوطن اور مولوی محمد شبلی صاحب ہم وطن یہاں موجود تھے جو ہر طرح پر غم میں اور ان کو اول منزل پہونچا میں مصروف تھے مگر کنور محمد فیاض علی خاں

صاحب رئیس پہاسُو اور کنور محمد عبدالغفور خاں صاحب رئیس دھرم پور نے اس وقت رشتہ مندوں سے زیادہ اُن کے ساتھ برتاؤ کیا محمد یونس خاں و محمد یوسف خاں و محمد موسیٰ خاں رئیسان دتاؤلی اور محمد حبیب الرحمن خاں رئیس بھیکم پور کنور محمد لطف علی خاں صاحب رئیس طالب نگر یہاں موجود تھے اور سب لوگ مثل عزیزوں کے اس حقیقی الوداع میں ہمدردی کے ساتھ شریک تھے۔ ہمارے شہر کے رئیس مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب بھی بہت سرگرمی سے اور فرض مذہبی کے ادا کرنے کے خیال سے اور ہمدردی سے شرکت رکھتے تھے۔

مسجد جامع کے سامنے میدان میں نماز جنازہ بعد نماز ظہر ادا کی گئی مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی مولوی لطف اللہ صاحب نے ان کے جنازہ کو کندھا دیا اور سب دوست مسلمان کندھا دیتے ہوئے وہاں تک لے گئے، جہاں آغوشِ مادر میں سپرد ہونا مقدر میں لکھا تھا۔

اس ضلع کے صاحب کلکٹر بہادر اور مسٹر اسمتھ صاحب نے بھی اخلاق اور ہمدردی اس واقعہ پر ظاہر کی وہ دونوں صاحب ایک مقام اثنائے راہ میں جنازہ آنے کے منتظر تھے جب بعد نماز جنازہ وہاں پہنچا تو دونوں صاحب جنازہ کے ساتھ پیدل ہو لئے اور قبر تک گئے اور ٹوپیاں اتارے کھڑے رہے جب قبر میں رکھ دیا اور ان کے جسم کو آنکھوں سے چھپا دیا جب وہاں سے چلے آئے تمام شہر کے لوگ ان دونوں صاحبوں کے اس اخلاق اور ہمدردی کے نہایت ممنون ہوگئے۔

غرضیکہ اس تمام قصہ کا انجام یہ ہوا کہ سب دوستوں نے مل کر اپنے ہم جنس اور اپنے ایک دوست کو درگاہ شاہ جمال کے احاطہ میں چند ہاتھ زمین کھود کر تیسری جنوری ۱۸۹۲ء روز یکشنبہ کو ڈھائی بجے دن کے سُلا دیا تو وہ خاک کا اوڑھنا اوڑھا دیا اور اکیلا چھوڑ کر چلے آئے خدا کرے جو نئے دوست ان کو ملے ہوں انھوں نے کہا ہو۔

نم کنومۃ العروس

دوشنبہ کے روز مولوی محمد کریم صاحب کے انتقال کے اظہارِ غم کے لئے مدرستہ العلوم جس کی افتتاح اول کے وقت وہ صدر انجمن ہوئے تھے بند کیا گیا

(۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء)

اہلِ صحافت

مولوی سیّد رونق علی صاحب مرحوم

ہمکو اس نوجوان لایق و فایق شخص کے انتقال کی خبر سننے سے ایک سخت صدمہ ہوا ہے اور ہمارے واسطے یہ واقعہ سانحۂ ہوش ربا بن گیا بہت تھوڑا عرصہ ہوا کہ ہم اس سنجیدہ شخص کی ملاقات بمقام علی گڑھ سے مشرف ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مہاراجہ صاحب بہادر پٹیالہ بہ عزم روانگی کلکتہ رونق افروز علی گڑھ ہوئے تھے۔ پس یہ نوجوان مرحوم بھی مہاراجہ صاحب بہادر کے ہمراہیوں میں تھا اور ایسے معزز گروہ میں تھا جس کی معیت یقیناً دلیل عزت تھی پس ہم کو اس وقت اس جلسہ کی تصویر خیالی کے دیکھنے سے جس میں مولوی رونق علی صاحب مرحوم جناب خلیفہ سید محمد محسن صاحب بہادر کے قریب بیٹھے ہوئے ہم سے باتیں کرتے تھے، بلا شبہ نہایت صدمہ ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں بھی ہم کو مولوی صاحب کے چہرہ سے آثار علالت نمایاں تھے اور ایک نوع کی نقاہت معلوم ہوتی تھی مگر بلا شبہ مولوی صاحب نہایت عالی ہمت شخص معلوم ہوتے تھے کہ باوجود اس ضعف کے اپنے آپکو بہت سنبھالے ہوئے تھے۔

ہماری نظر ہمیشہ ایڈیٹروں میں مولوی صاحب کے خیالات پر پڑتی تھی اور اس وجہ سے ہم مولوی صاحب کو وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے مگر چونکہ حیاتِ انسانی عالم سراب سے کچھ کم نہیں ہے اس سبب سے ہم کو ان دو مخالف باتوں کا ایک وقت میں تصور کرنا پڑتا ہے کہ یا مولوی صاحب دو چار روز ہوئے ایک جلسہ میں متانت کے ساتھ کلام کر رہے تھے اور یا اب تودۂ خاک میں دبے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کی موت کا چند وجہ سے بڑا صدمہ معلوم ہوتا ہے اول یہ کہ وہ ایک نوجوان شخص تھے جن کی موت کو ماتم سخت کہنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ لائق شخص تھے جن کی تنہا موت

بہت سے لوگوں کی موت کے برابر ہو تو عجب نہیں ہے مولوی صاحب کے سوانح عمری جو کسی قدر ہمارے ہمعصر صاحب راقم اودھ اخبار نے تحریر فرمائے ہیں وہ ہمارے دل کو بہت زیادہ ملول کرتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے یہ موت نہایت حسرت ناک معلوم ہوتی ہے اور ان سب امور کے علاوہ مولوی صاحب مرحوم میں وفاداری کا جوہر ایسا بے نظیر تھا کہ ان کے تمام اوصاف پر بالا تھا اور اسی وجہ سے ان کے آقائے نامدار منشی نول کشور صاحب کو سخت صدمہ ہوا جس کی کیفیت منشی صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوتی ہے جو انھوں نے اودھ اخبار میں چھپوائی ہے پس اب ہم مولوی صاحب کے کمالات کے خیال کرنے اور انکی سوانح عمری دیکھنے اور منشی صاحب کی تحریر ان کی نسبت پڑھنے سے جہاں تک رنج و افسوس کریں حق بجانب ہے اور جہاں تک اس غم میں ان کے ماتم کرنے والوں کے شریک ہوں بجا ہے۔ یہ گردشِ افلاک اہلِ کمال کے لیے گردشِ آسیا ہے جس میں اکثر اہلِ کمال ہی پستے ہیں پس اگر ہم ان کے برادر گرامی منشی محمود علی صاحب کی عالی خدمت میں کوئی تعزیت نامہ پیش کریں تو کوئی حاجت نہیں ہے۔

سنہ ۱۸۷۶ء

افسوس صد افسوس

ہم کو اس خبر کے دیکھنے سے سخت قلق ہوا کہ ہمارا ایک لائق ہمعصر جو اپنی تیزی طبیعت اور حدت مزاج اور قوت حافظہ کے لحاظ سے یکتا تھا اس نے اس جہانِ فانی سے انتقال کیا ہم کو اس کا نام لکھنے سے درد معلوم ہوتا ہے اور ہم کو یہ بات کہتے رنج ہوتا ہے کہ محمد وجاہت علی خاں صاحب مالک و راقم اخبار عالم اس جہانِ فانی سے انتقال کر گئے۔ ہم کو اپنے دوست کے اخلاق یاد آتے ہیں اور ہم بجز صبر کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی افسوس کے لائق بات ہے کہ خاں صاحب مرحوم کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس کارخانے کو سنبھال سکے کیونکہ خاں صاحب مرحوم نے صرف ایک لڑکا چھوڑا ہے جس کی عمر چار برس کی ہے اور ایک بیوی ہے جو بیچاری کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ خانصاحب ممدوح کا کارخانہ اب یوماً فیوماً روبہ ترقی تھا اور اب اُن کے مطبع نے ترقی پائی تھی اور اس کے پاس اب اچھا سامان مہیا ہو گیا تھا مگر افسوس ہے کہ سب کو یوں ہی چھوڑ گئے اور صرف اپنے اعمال اپنے ہمراہ لے گئے۔ دیکھئے وہاں کیا ہوتا ہے۔

و ۱۸۷۶ء

انتقال پُرملال شمس العلماء خان بہادر مولوی کبیر الدین احمد صاحب

ہم کو اُردو گائڈ اخبار سے اس خبر کے معلوم ہونے سے کہ ۲۲ اپریل روز سہ شنبہ کو ساڑھے آٹھ بجے شب کے جناب مولوی صاحب ممدوح نے انتقال کیا۔ نہایت رنج و افسوس ہوا ہے۔ کلکتہ میں مولوی صاحب باعتبار علم و فضل و اخلاق کے نہایت برگزیدہ شخص تھے۔ کلکتہ کے مسلمانوں کو خصوصًا ان کے انتقال سے نہایت صدمہ پہنچا ہے خدا تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

و ۲۳ اپریل ۱۸۸۹ء

ملازمین مدرسۃ العلوم

حافظ عبدالرزاق مرحوم

نہایت رنج وافسوس سے ہم اس خبر کو لکھتے ہیں کہ حافظ عبدالرزاق صاحب نے جو ابتدائے تقرر چھاپہ خانہ وسوسیٹی ہمارے چھاپہ خانہ کے مہتمم تھے شب جمعہ گذشتہ کو انتقال کیا۔ دس روز سے بخار میں مبتلا ہوئے تھے۔ ہرچند علاج ہوئے کوئی مفید نہ ہوا۔ نہایت نیک فرشتہ سیرت، پاک صورت، حافظِ قرآن مجید، صاحبِ تقویٰ، نیک نہاد ایماندار شخص تھے سیئن ٹیفک سوسیٹی کے چھاپہ خانہ کا تمام انتظام واہتمام اُن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہایت سچی دل سوزی سے جو ٹھیک ایک نہایت ایماندار ملازم کا کام ہے اپنی خدمت بجالاتے تھے سوسیٹی کے انتظام میں متعدد دفعہ ابتریان واقع ہوئیں مگر حافظ صاحب مرحوم اپنے ایک ہی طریقہ ایمانداری وفاداری پر تا دمِ زیست چلتے رہے۔ درحقیقت ایک نیک نہاد شخص دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں اُن کی وفات سے سیئن ٹیفک سوسیٹی کو درحقیقت ایک نہایت صدمۂ عظیم پہنچا ہے اور اسی لئے یہ اخبار جو انھیں کے اہتمام سے شروع ہوا تھا بیادگاری ان کے غم کے اپنے تئیں سیاہ پوش کرتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۱۸۷۸ء

وفات مُنشی ذُوالفقار خاں

نہایت رنج اور افسوس کا مقام ہے کہ آج پانچ بجے صبح کے منشی ذوالفقار خاں نے جو مدرستہ العلوم کی کمیٹی کے قدیم الخدمت منشی تھے اور جو نہایت ایمانداری و دیانت داری سے کام انجام دیتے تھے اس جہانِ فانی سے انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نیک اور نیک خصلت انسان کا دُنیا سے اُٹھ جانا نہایت افسوس و رنج کا مقام ہے جو شخص مرجاتا ہے وہ تو آرام کی جگہ میں چلا جاتا ہے مگر جن کو اس کی نیکی اور نیک خصلت سے فائدہ پہنچتا تھا وہ رنج والم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نہایت خوش نصیب ہے وہ شخص جو دنیا سے گزر گیا اور لوگوں میں اپنی نیکی کی یادگار چھوڑ گیا۔ وللہ درمن قال۔

زانگونہ بزی کہ چوں بمیری
گویند کہ شمع بود گُل شُد

۱۸ جون ۱۸۸۳ء

وفات احمد حسین خاں بی اے

نہایت رنج وغم سے ہم اس خبر کو لکھتے ہیں کہ احمد حسین خاں بی اے کا جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کے ڈگری یافتہ تھے اور بالفعل مدرستہ العلوم کی اسکول ڈپارٹمنٹ میں سکنڈ ماسٹر تھے آج ساڑھے آٹھ بجے دن کے انتقال ہوگیا۔ ان کو شدید بخار اور صفراوی قے جو انکا ایک قدیم مرض تھا شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کو بخار تھا مگر جمعہ کو وہ مدرسے گئے اور اس وقت کچھ زیادہ بیمار نہ تھے مگر اس کے بعد مرض نے نہایت شدت کی۔ ہر قسم کا علاج ہوا مگر موت کا کچھ علاج نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۸۸۷ء

لالہ گلاب رائے

نہایت افسوس ہے کہ لالہ گلاب رائے جو مدت دراز سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے چھاپہ خانے میں فورمین تھے اور نیک طبیعت و محنتی اور لائق اور اپنے کام میں بہت ہوشیار تھے دفعتاً انتقال کر گئے۔

مرنے سے تھوڑی دیر پہلے خاصے بھلے چنگے تھے۔ علی گڑھ سے تین چار دن کی رخصت لے کر آگرہ گئے تھے وہاں پہنچے دو ایک دن رہے پھر اپنے ایک رشتہ دار کے گھر گئے جو آگرہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا راستہ میں بیٹھ گئے اور یکایک مر گئے۔ چھاپہ خانے کو اُن کے مرنے سے نہایت افسوس ہے۔ ایک نہایت لائق آدمی اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

و ۱۸۸۹ء

رؤسا اور اہل کارانِ حکومت

واقعۂ جانکاہ

ولایت کی تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ کرنل جی ڈبلو ہملٹن صاحب سی ایس آئی کمشنر دہلی نے جو بہ تقریب رخصت ولایت کو تشریف لے گئے تھے وفات پائی اور اپنے جملہ ہواخواہ ہندوستانیوں کو سخت رنج و مصیبت میں گرفتار کیا۔ یہ صاحب ہماری سوسیٹی کے معاون ممبر تھے اور ہر ایک امر میں جس سے سوسیٹی کی ترقی مقصود ہو نہایت توجہ مبذول فرماتے تھے۔ بمنبع فہم و فراست اور چشمۂ عدل و داد تھے اور اہلِ ہند کے ساتھ کمالِ مہربانی اور دلجوئی سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ صاحب مہتمم اخبار مضیلیٹ نے انکی شان میں لکھا ہے کہ ہم اس امر کے بیان سے کہ ہمارے صاحب کمشنر جب تک وہ بقیدِ حیات رہے سب لوگ اُن کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور اب اُن کے مرنے پر سب کفِ افسوس ملتے ہیں گویا دہلی کے ان ہندوستانی باشندوں کے خیالات کو ظاہر کرتے ہیں جو اب تک ان کی مہربانی اور عنایتوں کو نہیں بھولے اور اگرچہ وہاں بعض لوگ ان کے ہی ملک کے ایسے بھی ہیں جن کو ان کی محبت و الفت بہت کم ہے لیکن ہم کو یقین ہے کہ دہلی میں ایسے اہلِ یورپ بہت سے ہیں جو ایک مہربان اور خلیق دوست کے تلف ہونے پر نہایت افسوس کریں گے۔

جس زمانے میں شریف خاندان کے مسلمان غدر کے صدمے سے سخت تکلیف میں گرفتار تھے اور بعضے نہایت آسودہ اور متمول لوگوں کی مفلسی سے دریوزہ گری پر نوبت پہنچ گئی تھی اس زمانے میں کرنیل ہملٹن صاحب نے ان کے ساتھ حد سے زیادہ غربا نوازی اور شفقت کی اپنی جیبِ خاص سے اُن کے کھانے پینے کو خرچ دیا اور اپنے قلمِ فیض رقم سے انکے حق میں گورنمنٹ کو بڑی بڑی سفارشیں لکھیں اور ایسی کوششیں کیں کہ آخرکار اکثروں کو گورنمنٹ سے پنشن اور ان کے نقصان کا معاوضہ دلوایا۔ کرنیل صاحب کے یہ نیک کام ہی اُن کے

اوصافِ حمیدہ کی تصدیق کو کافی ہیں کچھ حاجت زیادہ بیان کی نہیں ہے۔ کرنل ہملٹن صاحب کے مرنے سے گورنمنٹ کے ہاتھ سے ایک لیئق افسر جاتا رہا اور کمیشن پنجاب کا نہایت عمدہ قانون داں ضائع ہوا اور ہندوستانیوں کا ایک بڑا مہربان و شفیق دوست اور انگریزوں میں سے ایک کامل اُردو داں جاتا رہا اور بہت سے انگریز لوگوں کی مانند جو پیشتر سے راہیٔ ملکِ بقا ہوئے کرنیل ہملٹن صاحب کو اُنکی کارگزاریوں اور نمایاں خدمتوں کا پورا پورا عوض گورنمنٹ سے نہ ملا۔ جو کچھ انھوں نے ملتان کے مقام پر ۱۸۵۷ء کی مشکلوں میں کام کیا۔ ان کا حال صرف گورنمنٹ اور اُن کے دو چار دوستوں ہی کو معلوم ہے کوئی ایسا عوض نہ ملا کہ جس سے تمام جہاں میں ان کا شہرہ ہوتا۔ اسی وجہ سے اکثر آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ خطاب سی ایس آئی کا ملنا ان کے لئے کوئی کافی عوض نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اس قلیل عزت و افتخار کا بھی ثمرہ نہ اُٹھایا۔ جس زمانے میں ان کو یہ خطاب ملا وہ نہایت بیمار تھے اور چند روز کے ہی بعد فوت ہوئے لیکن ہم کو اُمید ہے کہ کرنل ہملٹن صاحب کا نام ان لوگوں کے دلوں میں جو انکو خوب جانتے ہیں مدت تک قائم رہے گا اور سب کی زبان پر انکا ذکر خیر رہے گا۔

و ۱۸۶۹ء

واقعۂ جانکاہ

ازروئے ایک تار برقی آمدہ حیدر آباد کے معلوم ہوا کہ مسٹر اے ایس رابرٹس صاحب بہادر جو حال میں حیدر آباد کے ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تھے بعارضہ اسہال یکم مئی کی شب کو راہی عالم جاودانی ہوئے ہم کو اس خبر کے سُننے سے نہایت رنج و افسوس ہوا اور ہم کو یقین ہے کہ ہر ایک شخص کو جس نے صاحب ممدوح کے اخلاق اور لیاقت کا حال سُنا ہوگا اس خبر کے سُننے سے کمال رنج ہوگا۔ صاحب ممدوح چند روز سے اس عارضہ میں مبتلا تھے اور حال میں تبدیلی آب و ہوا کی خاطر بولارن کو تشریف لے گئے تھے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ صاحب ممدوح نے دربار حیدر آباد کی ریزیڈنسی کا کاروبار اپنی ملازمت کے قلیل زمانے میں بڑی لیاقت اور ہوشیاری سے انجام دیا اور حیدر آباد کے تمام ہندوستانی اور انگریزی باشندے ان کے ثناخواں تھے اور والیٔ حیدر آباد اور تمام درباری ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہ صاحب ہماری سوسیٹی کے ایک معاون ممبر تھے۔

و سنہ ۱۸۶۸ء

وفات مولوی سید اعظم الدّین حسن خاں بہادر کے سی ایس آئی

نہایت رنج و افسوس ہے کہ ابھی چند روز کی بات ہے کہ ہم نے دربار آگرہ میں مولوی صاحب مرحوم کو اسٹار آف انڈیا پہنتے دیکھا تھا اور اب اُن کی وفات کی خبر سُنتے ہیں مولوی صاحب چند مہینے سے علیل تھے۔ آخر کار ۲۸ مئی ۱۸۶۸ء روزِ پنجشنبہ کو انھوں نے اس جہاں سے انتقال فرمایا۔ مدت سے سرکاری نوکر تھے۔ گورنمنٹ بنگال کی کونسل میں بھی ممبر رہے تھے۔ تیس برس صوبہ بہار میں وہ رہے۔ ان کی وفات سے کوئی شخص کیا ادنیٰ اور کیا اعلیٰ ایسا نہیں ہے جس کو تاسف نہ ہو واقعی بات یہ ہے کہ مسلمان نوکر ان سرکاری میں ایسا جامع علم و اخلاق و عزّت و توقیر کا دوسرا کوئی نہ تھا۔ ان کی وفات سے صرف ان کے احباب ہی کو رنج نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کو افسوس و رنج کرنا چاہیئے کہ ان کی قوم کا ایک ایسا شخص جو تمام قوم کی عزت کا باعث تھا دُنیا سے جاتا رہا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۲۸ مئی ۱۸۶۸ء

وفات دیوان کرپا رام

اگر ہم دیوان کرپارام صاحب کے انتقال کی نسبت نہایت افسوس ظاہر کریں تو ہمارا یہ افسوس کچھ اس لحاظ سے نہ ہوگا کہ ریاست جموں کا ایک وزیر مرگیا اور نہ ہمارا افسوس اس لحاظ سے ہوگا کہ وہ کسی خاص مذہب کا حامی مرگیا اور نہ اس لحاظ سے ہوگا کہ وہ ایک دانشمند ذی عزت شخص مرگیا بلکہ ہمارا افسوس اس لحاظ سے ہوگا کہ مذکورہ بالا وجوہ سے قطع نظر ایک نہایت مہذب شائستہ اور ذی علم با تدبیر روشن رائے انسان مرگیا جس کی مثل پیدا ہونے کو بہت سی مدت اور بہت سے ذریعوں کی ضرورت ہوگی اور اس میں شک نہیں ہے کہ اس لحاظ سے ہمارا افسوس بہت بڑا افسوس ہوگا۔ بہت سی ریاستوں کے رئیس اور والی مرگئے یہ تو وزیر ہی تھے۔ مگر ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ ایسے شخص کا مرجانا تمام رونقِ کشمیر کا تہ و بالا ہوجانا ہے۔ اگر ہم تمام ریاست کشمیر کو ایک خوشنما پھول تصور کریں اور دیوان کرپا رام کو اس کی خوشبو سمجھیں تو کچھ غلط نہیں ہے یا ہم تمام کشمیر کو ایک شخص فرض کریں اور دیوان کرپا رام کو روح کہیں تو کچھ بیجا نہیں ہے اور اس لحاظ سے اب ہم کو کہنا چاہیئے کہ گلزار کشمیر کی بوئے خوش جاتی رہی یا شخص کشمیر بے روح ہوگیا۔

دیوان صاحب موصوف کو اہل کمال سے نہایت اُلفت تھی اور وجہ یہ تھی کہ دیوان صاحب خود بھی اہلِ کمال سے تھے فلسفیات کا شوق زیادہ اور بالتخصیص الہٰیات میں انکو ایک ملکہ تھا۔ دیوان صاحب کے دماغ میں انتظامی قوت اور ان کی طبیعت میں اخلاقی ملکہ غالب تھا اور یہی سبب ان کے ایسی شہرت اور ہر دلعزیز ہونے کا ہوا اور یہ بھی صحیح ہے کہ دیوان صاحب اہل کمال کے ساتھ بہ فیاضی پیش آتے تھے جس کے سبب سے

دہ اہلِ کمال کا مرجع وماوا ہو رہے تھے. مذہبی مباحثہ کا دیوان صاحب کو بڑا شوق تھا اور اس اخیر زمانے میں ایک کتاب بھی تصنیف کر گئے ہیں اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے کہ ایسے لائق شخص کے انتقال پر جہاں تک افسوس ہو احق بجانب ہے۔ لیکن کیا ہمارا افسوس مردہ کو زندہ کر سکتا ہے۔ یا زندہ کو موت سے بچا سکتا ہے ہرگز نہیں۔ کل نفس ذائقۃ الموت و انما توفون اجورکم یوم القیامۃ۔ فمن زُحزِحَ عن النار وادُخل الجنۃ فقد فاز۔ وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

و السلام

افسوس افسوس ہزار افسوس

ہم کو جناب چوبے دھنپت رائے صاحب بہادر مدار المہام ریاست چھترپور کہین برادر راجہ جے کشن داس صاحب بہادر کے انتقال کی خبر سننے سے نہایت افسوس ہوا چوبے صاحب بہادر، نوجوان، خوبصورت وجیہہ، خوش خلق، نہایت لطیف الطبع شخص تھے۔ ایسے شخص کے انتقال سے جو صدمہ اس کے دوست احباب اور عزیز اور قرابت داروں کو ہوتا ہے اُس کی کچھ تصریح نہیں ہو سکتی علاوہ نوجوانی کے یہ معزز شخص سراپا لیاقت اور عین تہذیب تھا اور اس کی لیاقت کے واسطے اس کی ملازمت کے مختلف عہد گواہ تھے جس زمانہ میں چوبے صاحب علی گڑھ اور ہاتھرس میں تحصیلدار تھے وہ ایک نہایت نازک اور خوفناک زمانہ تھا مگر آج تک علی گڑھ بلکہ ضلع علی گڑھ اس بے نظیر شخص کی خوبی حکومت کا مداح ہے اور جس سے کوئی معاملہ پڑا وہی آج تک اس کی مدح میں رطب اللسان ہے اکبر آباد میں زمانۂ ڈپٹی کلکٹری میں وہ نیک نامی حاصل کی کہ آج تک اکبر آباد میں اس کا شہرہ ہے اور جب یہ چھترپور میں مدار المہام ہو کر گئے تو تمام اکبر آباد کو ان کی مفارقت کا صدمہ تھا۔ اب زمانۂ مدار المہامی کو ایسے لطف و خوبی سے گزارا کہ ایک اجنبی ریاست ان کو اسی عزت سے دیکھتی تھی جیسے اپنے اصلی راجا کو دیکھتی تھی۔ بس یہ سب امور چوبے صاحب کی اس بے انتہا لیاقت پر دال ہیں جو ہر ایک انسان کے واسطے مایہ شرف ہے اس لحاظ سے بھی ہم کو افسوس ہے کہ چوبے صاحب ہماری سوسیٹی کے سکریٹری جناب راجہ جے کشن داس بہادر کے عزیز بھائی تھے جن کے صدمہ سے سوسیٹی بھی ضرور افسوس کی حالت میں گرفتار ہے۔ علاوہ اس کے جناب چوبے صاحب ہماری سوسیٹی کے ایک

معزز اور نہایت ہمدرد ممبر تھے جن کی مفارقت سے سوسیٹی جہاں تک افسوس کرے بجا ہے چوبے صاحب علم دوست ایسے تھے کہ ہمیشہ سوسیٹی کے حالات اور اس کے اخبار کتب کی نسبت استفسار فرماتے تھے پس ان سب امور پر نظر کرنے کے بعد ہم کو جس قدر افسوس چوبے صاحب کے انتقال کا ہوا ہے ہم اس کی کچھ حد بیان نہیں کر سکتے مگر چونکہ قضائے کردگار کا کوئی ٹالنے والا نہیں ہے اس لحاظ سے ہمارا افسوس کیا نتیجہ بخش سکتا ہے مگر یہ کہ وہ مقتضائے بشریت کے سبب سے ہوتا ہے جس سے ہمارے قصد کو کچھ دخل نہیں ہے۔ افسوس ایں ماتم سخت کہ گویند جواں مرد۔

و ۱۸۷۷ء

حاجی فیض احمد خاں مرحوم

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ ہمارے ضلع کے ایک نامی وگرامی رئیس حاجی فیض احمد خاں رئیس وتاولی نے جو مدت دراز سے مکہ معظمہ میں رہتے تھے اور کبھی کبھی یہاں تشریف لاتے تھے بعارضۂ اسہال کبدی مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خاں صاحب ممدوح اس ضلع کے بہت بڑے تعلقہ داروں میں تھے اور مکۂ معظمہ و طائف میں بھی انھوں نے بہت سی جائیداد اور باغات خرید لئے تھے۔ جائیداد واقع مکہ معظمہ وطائف حسب قانون ٹرکی بالفعل قرق ہوگئی ہے۔ مگر ہم نے سنا ہے کہ تھوڑا عرصہ ہوا جب ہندیوں سے جنھوں نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کی تھی اور تاہل بھی کر لیا تھا پوچھا گیا کہ تم کس کی رعیت ہو کر مکہ معظمہ میں رہنا چاہتے ہو سلطنت عثمانیہ ٹرکی کی یا گورنمنٹ انگریزی کی۔ اس وقت حاجی صاحب نے کہا تھا کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہیں اور گورنمنٹ انگریزی ہی کی رعیت ہو کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اُمید ہے کہ باعانت متفضل جدہ انکی جائیداد واقع مکہ معظمہ وطائف وغیرہ بھی تلف نہ ہو سکے گی بہرحال ایسے ایک رئیس کے مرجانے کا نہایت افسوس ہے۔

و ۱۸۷۸ء

مسٹر ڈبلو۔ ایچ۔ اسمتھ صاحب

(سابق مہتمم بندوبست ضلع علی گڑھ)

ہم نہایت دلی افسوس و ملال کے ساتھ اس خبر وحشت اثر کو کہ مسٹر ڈبلو ایچ اسمتھ صاحب مہتمم بندوبست پیرس میں یکم جون ۱۸۷۹ء کو دنیائے فانی سے رحلت فرما ہوئے اپنے اخبار میں درج کرتے ہیں۔ صاحب ممدوح ایک مدت تک ضلع علی گڑھ میں رہے تھے اور آخیر بندوبست مالگذاری اس ضلع کا بھی صاحب ممدوح نے کیا تھا۔ بندوبست کا کام اگرچہ نہایت مشکل اور نارضامندی رعایا کا باعث ہے مگر درحقیقت صاحب ممدوح نے ایسے انصاف اور لیاقت سے کام کیا تھا کہ گورنمنٹ بھی راضی رہی اور تمام زمیندار اور تعلقدار اور کاشتکار سب دل سے رضامند اور خوش رہے۔ اس ضلع کے تمام رئیس اور زمیندار و کاشتکار سب کو دلی تعلق صاحب ممدوح کے ساتھ تھا اور ان کے اخلاق دوستانہ کا سب کے دل میں بے انتہا اثر ہے۔ تمام لوگوں کو اس انتقالِ پُر ملال سے نہایت رنج ہوا۔

و یکم جون ۱۸۷۹ء

نواب مرزا فیروز حسن خاں مرحوم

ہم کو اس خبر کے سُننے سے نہایت افسوس ہوا ہے کہ ساتویں اکتوبر ۱۸۸۱ء روز یکشنبہ کو نواب مرزا فیروز حسن خاں نے بہ مقام مدراس ذیابیطس کی بیماری سے انتقال کیا اگرچہ مرزا صاحب کا وطن دہلی تھا مگر مدّت دراز سے مدراس میں رہتے تھے اور جناب خیر النساء بیگم صاحبہ رئیس کرناٹک مقیم مدراس کے ہاں شادی کر لی تھی۔

مدراس میں نہایت نامی اور فیاض رئیس تھے اور سرکار نواب خیر النساء بیگم صاحبہ کا انتظام اور اہتمام کلیتاً ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے دو فرزند ارجمند ہیں اور نواب خیر النساء بیگم صاحبہ نے مثل اپنے فرزندوں کے ان کو اپنے پاس رکھا ہے مرزا محمد اسمٰعیل، مرزا صاحب مرحوم کے بھانجے بطور نائب بیگم صاحبہ کی سرکار کا کام کرتے تھے وہ بھی نہایت لائق اور ہوشیار ہیں اور اُمید ہے کہ ان کے سبب سے بیگم صاحبہ کی سرکار کا انتظام بدستور قائم رہے گا۔

۷ ، اکتوبر ۱۸۸۱ء

جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکم پور

افسوس صد ہزار افسوس کہ شب مابین سیزدھم و چہاردھم یکم جولائی ۱۸۸۶ء کو جناب محمد عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے اس جہانِ فانی سے انتقال فرمایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

درحقیقت شروانی افغان خاندانوں میں جو اس ضلع کے رؤسا میں سے ہیں عنایت اللہ خاں صاحب ان سب کے سرگروہ اور ایک فرشتہ صفت اور باعثِ افتخار اس قوم کے تھے۔ سچائی، صفائی، طینت محبت اور دوستی کا برتاؤ اُن پر ختم تھا۔ اپنی رائے اور اپنے نیک ارادوں پر ایسے مستقل تھے کہ کسی طرح اس میں ڈگمگاتے نہ تھے۔ حاجی داؤد خاں صاحب مرحوم کے والد بزرگوار ایسے نامی و گرامی تھے کہ انکی فیاضی و نیکی کی شہرت دور دراز ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

محمد عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم ہمارے مدرسۃ العلوم کے بھی نہایت حامی و مددگار تھے ۱۸۷۲ء سے کالج فنڈ کمیٹی کے ممبر تھے اور طرح طرح سے کالج کی مدد فرماتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کے باغ میں ایک کنواں انکا بنایا ہوا موجود ہے ایک پختہ بورڈنگ ہوس انھوں نے مدرسۃ العلوم میں بنوا دیا ہے۔ بورڈنگ ہوس کی تعمیر کیلئے دو ہزار روپیہ عنایت کیا ہے جو زیر تعمیر ہے پانسو روپیہ مدرسۃ العلوم کی مسجد کی تعمیر میں دیا ہے۔ مسجد کی نسبت ان کو بہت کچھ خیال تھا اگر وہ زندہ رہتے تو بہت کچھ مسجد کی تعمیر میں عنایت فرماتے۔ علاوہ اس کے متعدد دفعہ زرِ کثیر مدرسۃ العلوم کی امداد اور چندہ میں دیا ہے اور ہمیشہ دیتے رہتے تھے۔

افسوس ہے کہ اس ضلع کے پٹھان خاندانوں میں کا ایک نامی سرگردہ اور اس ضلع کا بہت بڑا رئیس دنیا سے جاتا رہا۔ اب پٹھان خاندانوں میں صرف محمدؐ عبدالشکور خاں صاحب بزرگ باقی ہیں خدا سے دُعا ہے کہ وہ بہت دنوں تک زندہ اور باعثِ اعزاز قوم رہیں۔

محمدؐ عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم کے دو بھتیجے احمد سعید خاں صاحب اور محمدؐ مزمل اللہ خاں صاحب موجود ہیں اور جوان صالح ہیں۔ خدا ان کو صاحبِ اقبال اور بامروت کرے اور جس طرح ان کے بزرگ اخلاق و محبت و دوستی کے برتاؤ میں نامور تھے اُسی طرح وہ بھی نامور ہوں۔

ویکم جولائی ۱۸۸۶ء

وفات شیخ اعتقاد علی

خاص علی گڑھ میں ایک خاندان اولاد حضرت شاہ جمال العارفین قدس اللہ سرہٗ کا ہے۔ یہ بہت پرانا خاندان ہے جس کے واسطے دو موضع ایک جمال پور دوسرا دھولیرہ سلاطینِ سابق کے عہد سے بنا مزد تیاز درگاہ شریف معاف ہیں جن کی آمدنی فاتحہ وعرس درگاہ شریف میں خرچ ہوتی ہے اور جو بچتا ہے وہ ان کی اولاد پر متولیوں کے اہتمام سے خرچ ہوتا ہے۔ شیخ اعتقاد علی صاحب اسی خاندان کے ایک معزز رکن تھے اور دیہاتِ مذکورہ کے متولی تھے۔ شیخ اعتقاد علی کثیر الملاقات تھے۔ سیکڑوں آدمیوں سے جو دور دراز ملکوں کے رہنے والے ہیں ان کی ملاقات تھی۔ شیخ صاحب کی شادی خاندان خواجہ عبدالغفار صاحب میں ہوئی تھی۔ شیخ صاحب موصوف تجارت نیل کا کام کرتے تھے جب وہ کسی سے لین دین یا خرید و فرخت کا معاملہ کرتے تھے وہ بہت صاف ہوتا تھا۔ تمام معاملہ کے لوگ ان سے راضی تھے۔ وہ بہت خوش اخلاق تھے اپنے دوستوں کے ساتھ نہایت محبت اور سچی دوستی سے ملتے تھے۔ دشمنوں سے کچھ خوف نہیں کرتے تھے۔ اپنے اعزاز کی وجہ سے وہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے ممبر بھی تھے۔ سالِ گزشتہ میں محرم کے انتظام میں انکی ذات سے بہت تقویت حاصل تھی لیکن وہ عرصے تپ مزمنہ میں مبتلا تھے۔ اسی وجہ سے واسطے انتظام ادائے وصولِ قرضہ اور اہتمام جائیداد کے ۲۵ جولائی ۱۸۸۶ء کو انھوں نے مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب کو ٹرسٹی مقرر کیا تھا مگر ایسی ہمت تھی کہ ہمیشہ اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ۲۴ اگست ۱۸۸۶ء کو جناب صاحب کلکٹر بہادر کی کوٹھی پر انتظام محرم کی کمیٹی میں شریک ہوئے۔ اسی روز ان کو جاڑہ آیا اور ۲۶ اگست ۱۸۸۶ء کو جاڑہ

کے صدمہ سے ایک بج کر بیس منٹ پر انتقال ہوا۔ دنیائے فانی کو چھوڑا۔ اپنے یگانوں سے منہ موڑا۔ انکی تجہیز و تکفین اسی دن ہوئی۔ جنازہ کے ہمراہ بہت زیادہ، ہجوم غیر معمولی تھا اکثر حکام ہندوستانی اور شہر کے تمام معززین ان کی نمازِ جنازہ اور دفن میں شریک ہوئے جو ان کے عام پسند ہونے کی دلیل ہے۔ جب ۲۸ راگست ۱۸۸۶ء کو میونسپل بورڈ کے اجلاس میں ان کے انتقال کی خبر بیان کی گئی تو بورڈ نے ان کے انتقال پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ الغرض وہ بہت خوب آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ انکی مغفرت کرے۔

و ۲۷ راگست ۱۸۸۶ء

حاجی الحرمین الشریفین نواب محمد کلب علی خاں بہادر

(فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ جی سی ایس آئی بہادر والیٔ رامپور کی وفات)

ہم کو نہایت رنج و افسوس ہے کہ جو دیرینہ علالت نواب صاحب مرحوم کو لاحق تھی اس سے افاقہ نہ ہوا اور آخر کار ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء روز چہار شنبہ کو اس دار ناپائدار سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا۔ ایسے عالی مرتبت رئیس کے انتقال سے قوم کو نہایت سخت صدمہ ہوا ہے۔

نواب صاحب مرحوم نہایت قابل ذی علم، شاعر، مدبر، منتظم، عالی ہمت، اخلاق مجسم فیاض، صاحب خیر و برکت تھے۔ حرمین کی نذورمیں اور مساجد کی تعمیریں اور مستحقین کو عطا اور انعام میں لاکھ ہا روپیہ صرف فرماتے تھے۔ مسلمانوں کو ان کی ذات فیض آیات سے ہر طرح کی تقویت تھی۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے بھی بہت بڑے حامی و مددگار تھے۔ متعدد دفعہ نقد روپیہ اس کی تائید میں عطا فرمایا اور ایک پرامیسری نوٹ وقف کیا جس کے محاصل سے بارہ سو روپیہ سالانہ بطور دوام از روئے سند کے مدرسۃ العلوم کے اخراجات کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ پس اہل اسلام جس قدر ایسے رئیس کے انتقال کا رنج و افسوس کریں سب بجا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء

مہاراجہ صاحب بہادر بنارس مرحوم

ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بہادر بنارس کو چند روز سے بخوبی شفا ہوتی جاتی تھی اور صبح و شام کو گاڑی میں سوار ہو کر ہوا خوری کے واسطے جاتے تھے لیکن ۱۱ر جون کو دفعتاً شدت سے دست شروع ہو گئے اور اگرچہ ڈاکٹر ہوپر نے حتی الامکان تدبیر کی لیکن مہاراجہ صاحب کی حالت رفتہ رفتہ خراب ہوتی گئی مسٹر لمسڈون کمشنر و ایجنٹ گورنر جنرل کل شام کو ہز ہائنس کے دیکھنے کے واسطے گئے اور ڈاکٹر ہوپر تمام رات موجود رہے۔ صبح کو مہاراجہ صاحب کی حالت ردی ہو گئی اور ان کے دوست راجہ شیو پرشاد بلائے گئے جب آرام ہونے کی اُمید بالکل نہ رہی تو مہاراجہ صاحب چار بجے صبح کو پالکی میں اپنے باغ واقع کمان چاہ کو جو شہر کے مقدس حوالی میں ہے بھیج دیئے گئے اور وہاں ۱۳ر جون کو قریب چھ بجے کے اُن کا دم نکل گیا۔

تجہیز و تکفین کی رسم سات بجے سے ساڑھے نو بجے تک عمل میں آئی اور انبوہ کثیر لوگوں کا اس کے مشاہدہ کے لئے ملیوں کا گھاٹ پر موجود تھا۔ مہاراجہ صاحب کے بھتیجے اور متبنیٰ کنور پربھو نرائن سنگھ نے جن کو قریب ترین رشتہ دار ہونے کے لحاظ سے یہ خطاب اور جائیداد ملے گی۔ چتا میں آگ لگائی جس میں بہت سی صندل کی لکڑی چنی ہوئی تھی مہاراجہ صاحب بہادر کے قلعہ رام نگر سے توپیں فیر کی گئیں اور بطور نشانی تعظیم و تکریم کے سرکاری دفتر بند رہے اور اسی وجہ سے جلسہ کنسرٹ بھی ملتوی کر دیا گیا۔

مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ مرحوم کو ستر واں سال تھا اور لوگوں کے

تمام فرقوں کو جو ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے اُن کی وفات پر نہایت رنج ہوا ہے وہ اپنی تمام زندگی میں ایک پکّے ہندو بنے رہے یہاں تک کہ اپنی جان کا بھی کچھ خیال نہ کر کے انگریزی دوا نہیں کرتے تھے جو راجہ خود مختار نہیں ہیں ان میں صرف وہ ہی ایک ایسے راجہ تھے جن کو جی سی ایس آئی کا خطاب ملا تھا اور اُن کے حین حیات میں خاندانی خطاب راجگی کے سادہ خطاب سے مہاراجہ کے خطاب تک بڑھا دیا گیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات سے سب سے اخیر پُرانا مہاراجہ گزر گیا کیونکہ ان کے ہم عصر مہاراجہ صاحب بہادر بُوندی کا انتقال حال میں اُن سے پہلے ہو گیا تھا۔

و ۱۳ جون ۱۸۸۹ء

انتقالِ پُر ملال نواب سرسالار جنگ

ہم اس خبر کو نہایت رنج و غم و افسوس سے لکھتے ہیں کہ ساتویں جولائی ۱۸۸۹ء کو ہز ایکسلنسی نواب سر سالار جنگ میر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت میر لائق علی خاں بہادر کے سی آئی ای اپنی بیماری لاحقہ سے انتقال فرمایا ان کی عمر صرف چھبیس ۲۶ برس کی تھی۔ کون شخص ہے جو انکے نام سے واقف نہ ہوگا ہزاروں خوبیوں میں جو اُن میں تھیں اپنے والدِ بزرگوار مرحوم کا نمونہ تھے بلکہ بعض باتوں میں اُن سے بھی سبقت رکھتے تھے خوش رو اور خوش خو۔ نیک طبیعت، فیاضی اخلاق مجسم، سادگی مزاج، صفائی باطن عالی ہمتی اور دنیا و حشمت دنیا کو حقیر سمجھنا یہ تمام صفتیں ان میں اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ اُن کے والدِ بزرگوار نے نہایت اہتمام سے ان کی تعلیم و تربیت کی تھی۔ نہایت عمدہ فارسی جانتے تھے فارسی زبان میں بے تکلف اور فصیح گفتگو کرتے تھے: تعجب یہ ہے کہ ان کا لہجہ بالکل ایرانیوں کا سا تھا اور جب کہ وہ فارسی زبان میں گفتگو کرتے تھے تو کوئی شخص ان کے لہجہ سے ان کا ہندوستانی ہونا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ شعر و سخن کا بہت ذوق تھا! اساتذ ایران کے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ رات کے وقت ہمیشہ تھوڑی دیر تک شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ انگریزی میں معتد بہ استعداد رکھتے تھے نہایت با محاورہ گفتگو کرتے تھے اور لمبی لمبی اسپیچیں نہایت فصاحت سے انگریزی زبان میں دیتے تھے۔ ذہن و ذکا اعلیٰ درجہ کا تھا حافظہ تو ایسا بے نظیر تھا کہ ہم نے کسی کا نہیں دیکھا۔ ہماری چشم دید ہے کہ ایک موقع پر چند صفحے انگریزی عبارت کے لکھے ہوئے شاید دو دفعہ پڑھے اور اس کے تو دس گھنٹے کے بعد ایک مجلس میں گفتگو کی اور وہ سب عبارت جو انھوں نے پڑھی تھی لفظ بہ لفظ بالکل برزبان تھی۔ تعجب یہ ہے کہ اس گفتگو کے بعد ایک صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ آپ اپنی اسپیچ

مجھ کو لکھا دیں اسی وقت زبانی بتلاتے گئے اور وہ لکھتا گیا۔ دوسرے دن جو مقابلہ کیا تو سوائے ایک دو لفظ کے کچھ فرق نہ تھا ایسی قوتِ حافظہ جو بطور کہانیوں کے سُنی جاتی تھی ان میں موجود تھی اپنے دوستوں سے نہایت منکسر خلیق، بے تکلف دوستانہ برتاؤ رکھتے تھے لیکن معزوروں سے نہایت زیادہ معزور و متکبر تھے جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ یقین کرتے ہونگے کہ ان میں اسٹیٹس مین ہونے کی نہایت لیاقت تھی۔ ان کے آرٹیکل جو زمانۂ سفر یورپ میں یورپ کے اخباروں میں چھپے ہیں وہ اسکی شہادت دے رہے ہیں اور ان میں قوتِ علمی اپنے والد بزرگوار سے بھی زیادہ تھی۔ مخالف طبع یا ناواجب بات کی برداشت ان میں مطلق نہ تھی اور اس کے آگے کسی چیز کی انکو پرواہ نہ ہوتی تھی حضور عالی نظام دام ملکہ کی عنایت و شفقت زمانہ طفولیت سے ان پر تھی۔ ابتدائے ۱۸۸۴ء میں حضور عالی نظام نے انکو ان کے والدِ بزرگوار کی جگہ مدار المہام سلطنت دکن مقرر کیا جس کے لئے وہ ہر طرح پر موزوں تھے وہ بمقتضائے اپنی طبیعت و فطرت کے اس عہدۂ جلیلہ کو ایسا نہیں سمجھتے تھے جن کے لئے وہ اپنی طبیعت کو بدل دیتے اسی کے ساتھ حضور عالی نظام کی عنایت و شفقت قدیم نے ان کو اور بھی پروردۂ نعمت و شفقت آقا بنا دیا تھا انھوں نے حضور عالی نظام کی پرورش و شفقت پر بھروسہ کیا اور ۱۸۸۷ء میں عہدہ سے مستعفی ہو گئے مگر حضور نظام نے اسی قدر شفقت کے سبب بعد استعفے کے بھی اُن کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ایک بادشاہ قدر دان و فیاض کو زیبا تھا۔

۱۸۸۴ء میں مدرسۃ العلوم کے ملاحظہ کے لئے وہ علی گڑھ تشریف لائے تھے اور جسطرح ان کے والدِ بزرگوار سرپرست اور پیٹرن مدرسۃ العلوم کے تھے اسی طرح انھوں نے پیٹرن ہونا منظور کیا تھا پس خاص ہمارے کالج کو یہ بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے کہ اس کا بہت بڑا پیٹرن ہاتھ سے جاتا رہا۔ انھوں نے ایک چھوٹا بچہ کئی دن کا اپنے بعد چھوڑا ہے مگر زیادہ تسلی تو اب غیور جنگ شجاع الدولہ منیر الملک بہادر ان کے برادرِ خورد سے ہے جو ہمہ صفت متصف ہیں اور خاندانِ سالارِ جنگ بلکہ میر عالم کے وہی چشم و چراغ ہیں۔ خدا سے امید ہے کہ وہ بہت دنوں تک زندہ رہیں اور سالارِ جنگ کے خاندان کا نام اُن سے روشن رہے اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ حضور عالی نظام اس قدیم خاندان کی عزت و شہرت و نام کو بدستور قائم رکھیں گے۔ خدا تعالیٰ حضور عالی نظام کو سلامت رکھے جن کی ذات فیض آیات سے یہ سب کرشمے ہیں اور جن سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو عزت و افتخار ہے۔

مدرسۃ العلوم مسلمانان میں دسویں جولائی روز چہار شنبہ کو جب کہ کالج و اسکول کے سب طالب علم جمع ہو گئے اور قرآن مجید پڑھا جا چکا تھا۔ پرنسپل صاحب نے کالج کلاسوں میں اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کلاسوں میں اس سانحہ جانکاہ کو بیان کر کے بطور نشانِ غم کے کالج و اسکول کو بند کر دیا۔ اب ہم سالارِ جنگ مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ خدا اُن کی مغفرت کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ، رجولائی ۱۸۸۹ء

وفات مولوی عبدالقیوم صاحب

نہایت افسوس ہے کہ مولوی عبدالقیوم صاحب سب جج بریلی کو جنھوں نے ۲۷ جنوری کو پنشن لی تھی بائیسویں فروری کو انتقال ہو گیا۔

مولوی صاحب ممدوح نہایت نیک اور بہت ہی بااخلاق تھے۔ دوستوں سے نہایت دوستی وار تباط رکھتے تھے جہاں رہے نیک نام اور معزز رہے۔ ان کے انتقال سے ان کے تمام دوستوں کو نہایت رنج وملال ہے۔ مراد آباد میں انکا انتقال ہوا۔ خدا ان کی روح پر رحمت کرے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

و ۲۲، فروری ۱۸۹۰ء

دہلی اور دو نامی اور لائق شخصوں کی وفات

افسوس ہے کہ مرزا سلیمان جاہ جو خاندانِ تیموریہ کے ایک معزز شاہزادہ تھے اور حکامِ وقت اور شہر کے لوگ ان کی عزت اور ادب کرتے تھے اس ہفتہ میں انتقال کر گئے لوگوں کو انکے انتقال کا بہت افسوس ہے۔ ایک گروہ کثیر باشندگانِ شہر کا ان کے جنازہ کے ساتھ تھا۔

دوسرا واقعہ بھی اس سے کچھ کم سخت نہیں مولوی رضی الدین صاحب جو مولوی سلیم الدین خاں صاحب کے بیٹے اور مولوی رشید الدین خاں صاحب کے پوتے تھے اس جہانِ فانی سے انتقال کر گئے نہایت صالح و نیک سلیم الطبع خوش خلق تھے اور خط نستعلیق میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے سید امیر پنجہ کش جو نہایت نام آور خوش نویسوں میں گزرے ہیں اِن کو تمام لوگ اُن کے ہم پلہ سمجھتے تھے نہایت افسوس ہے کہ یہ مولوی سلیم الدین خاں صاحب کو جن کے صرف وہی ایک فرزند تھے آخری وقت میں ایسا صدمہ پہنچا ہے اور دہلی ایک بے مثل صاحبِ کمال سے خالی ہو گئی ہے۔

و ۱۸۹۰ء

نواب منیرالملک مرحوم

افسوس صد ہزار افسوس کہ ۲۶ر دسمبر کی صبح کو نواب منیرالملک نے جو چھوٹے بیٹے نواب مختارالملک سرسالارجنگ کے اور چھوٹے بھائی دوسرے سالارِ جنگ نواب لایق علی خاں کے تھے اس جہان سے رحلت فرمائی۔ ابھی سالارِ جنگ نواب لایق علی خاں کے انتقال کا غم لوگوں کے دلوں سے نہیں بھولا تھا کہ قضاو قدر سے یہ تازہ حادثہ پیش آیا نواب منیرالملک نہایت متین اور ذی وقار اور مجمع تمام خوبیوں کے تھے ان کے اخلاق نہایت وسیع تھے دانشمندی اور لیاقت میں لائق و فائق تھے۔ ان کے انتقال کا صدمہ نہ صرف حیدرآباد کے لوگوں کو رنج دہ ہے بلکہ ہماری قوم کے لئے ایک سخت غم اندوز واقعہ ہے کیونکہ ہماری قوم سے ایسا شخص جو ایک نشانی نہایت معزز و محترم خاندان کا تھا اور خود اپنی ذات سے سرداری کے لائق تھا دنیا سے جوان عمر میں اُٹھ گیا۔

مختارالملک سرسالارجنگ کی خدمتیں سلطنت حیدرآباد کی اور ان کے احسانات حیدرآباد کی نسبت ایسے ہیں جو قیامت تک یادگار رہیں گے۔ سب سے بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے انتقال سے ایک نہایت نامی و گرامی خاندان میرعالم اور مختارالملک سرسالارِ جنگ کا بظاہر خاتمہ ہوگیا اگر کچھ توقع ہے تو یہ ہے کہ سالارِ جنگ میر لائق علی خاں کا نہایت کم سن فرزند موجود ہے خدا اس کو زندہ رکھے اور لائق و باقبال کرے اور اس کے سبب سے اس نامی و گرامی خاندان کا نام قائم رہے۔

و ۲۶ر دسمبر ۱۸۹۰ء

جنرل اعظم الدّین خاں مرحوم

ممبر آف کونسل آف ریجنسی رام پوُر اسٹیٹ

نہایت رنج و افسوس کا مقام ہے کہ ایسے معزز و بہادر شخص کو لوگوں نے نہایت بزدلی اور نامردی سے تیرھویں اپریل روز دوشنبہ کو گیارہ بجے رات کے گولیوں سے مار ڈالا۔

جنرل ممدوح ایک دعوت میں نہایت جریدہ ٹم ٹم پر سوار ہو کر گئے۔ بجز ایک سائیس کے اور کوئی خدمت گار تک بھی ان کے ساتھ نہ تھا۔ دعوت کھانے آتشبازی کا تماشہ دیکھنے کے بعد اسی ٹم ٹم پر سوار ہو کر گھر میں آتے تھے جب کہ اس محلے میں پہنچے جو عنایت خاں کی سیڑھیوں کے نام سے مشہور ہے وہاں ایک موڑ ہے اور راستہ تنگ ہے جب وہ اس میں پھرے تو گولیاں چلیں ٹم ٹم کے گھوڑے کو ایک گولی لگی گھوڑا اور ٹم ٹم گری اور اسی وقت ایک گولی جنرل اعظم الدّین خاں کے لگی۔ ہم نے سنا کہ وہ نہایت بہادری سے گولی کھا کر ان لوگوں کی طرف بڑھے جنھوں نے گولی چلائی تھی مگر اسی وقت چند گولیاں ان پر پڑیں اور وہ گر گئے اُن کے عقب میں حافظ مُبارک علی جو ہمارے کالج کے طالب علم شوکت علی کے چچا تھے اسی دعوت میں آئے تھے انھیں نے ان لوگوں کو للکارا ان پر بھی گولی پڑی اور تلوار سے بھی کام لیا گیا وہ بھی جنرل اعظم الدین خاں کے ساتھ مارے گئے دوسرے دن گیارہ بجے ان مظلوموں کی لاشیں دفن کی گئیں۔ صاحب کمشنر بہادر بریلی معہ دو کمپنی سپاہیوں کے انتظام کیلئے وہاں پہنچ گئے سب انتظام بدستور ہے صرف دو آدمی مارے گئے اور قاتل اب تک لا معلوم ہیں۔

ہم جنرل اعظم الدین خاں کے مارے جانے کا دوبارہ افسوس کرتے ہیں۔ جنرل اعظم الدین خاں نہایت عمدہ اور منتظم و نہایت لائق شخص تھے اور نہایت دل چلے اور بہادر تھے۔ شکار کے بہت شوقین تھے اور شیر کا شکار نہایت بہادری سے کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ایسے بہادر شخص کو اس بزدلی سے اور دغا سے مار ڈالا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۱۳ر اپریل ۱۸۹۱ء

بابو ابھیناش چندر مرحوم
جج اسمال کاز کورٹ اکبرآباد

ہم کو اس خبر کے سننے سے نہایت افسوس ہوا ہے کہ بابو ابھیناش چندر جج اسمال کاز کورٹ اکبرآباد نے دوسری اپریل کو آٹھ بجے دن کے انفلوئنزا کی بیماری سے جو آخر کو نمونیا تک پہنچ گئی تھی انتقال کیا۔

بابو ابھیناش چندر نہایت نیک با اخلاق سلیم الطبع اور نہایت منصف اور ہر دلعزیز حاکم تھے۔ چند سال تک وہ علی گڑھ میں سب آرڈینیٹ جج رہے اور ہر شخص ان کے انصاف اور اُن کے حسنِ اخلاق سے راضی و خوشنود تھا۔ ہم کو بابو ابھیناش چندر سے اس زمانہ سے واقفیت ہے جب کہ وہ منصف تھے وہ ہمیشہ حکام کی نظروں میں معزز اور اپنے ہم عہد افسروں میں ممتاز اور لوگوں کی آنکھوں میں با وقار رہے جس خوبی اور عمدگی سے اپنے متعدد عہدوں کا کام انجام دیا وہ ان اضلاع میں ایک نمونہ قابلِ پیروی سمجھے جاتے تھے۔ ان تمام اوصاف کے علاوہ اپنے دوستوں میں بھی نہایت معزز تھے ان کے دوستوں کو ان کی دوستی پر بھروسا اور ان پر ہر طرح کا اعتماد تھا۔ دوستوں کے ساتھ نہایت محبت و ہمدردی سے پیش آئے تھے۔ غرضکہ ہر ایک طرح کی خوبیاں خواہ ان کے عہدے کے متعلق اور خواہ پرپوٹ معاملات کی نسبت سب ان میں جمع تھیں۔ ایسے نیک شخص کے انتقال کا ہر کہ دمہ کو رنج ہونا انسانی طبیعت کا لازمہ ہے۔

رفاہِ عام کے کاموں میں بھی ان کو دلچسپی تھی جب تک وہ یہاں رہے مدرسۃ العلوم کے دوست اور خیر خواہ تھے ان کے بیٹے ستیش چندر نے جو یونیورسٹی کے تمام

امتحانوں میں سب سے اول رہا مدرستہ العلوم علی گڑھ ہی میں تعلیم پائی تھی۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں لا کلاس قائم ہونے کے وہی اول محرک ہوئے تھے۔

ہم نے سُنا ہے کہ جب وہ اکبر آباد میں گئے تو آگرہ کالج کی ترقی و بہبودی میں بہت کوشش کی اور یہ اوصاف اُن کے ایسے تھے کہ ہر قوم کے لوگوں کو ان کی وفات پر افسوس کرنا حق بجانب ہے۔

و ۲۰ اپریل ۱۸۹۲ء

نواب احمداللہ خاں مرحوم

رئیس اعظم میرٹھ

ہم کو نجم الاخبار اٹاوہ میں اس خبر کے پڑھنے سے کہ نواب احمداللہ خاں کا پندرھویں اپریل کو انتقال ہوگیا نہایت افسوس ہوا ہے نواب صاحب مرحوم بہت پرانے معزز خاندان کے تھے اور ان کے بزرگ عہدِ سلاطینِ مغلیہ میں نسلاً بعد نسلٍ نہایت معزز صاحب منصب وخطاب ہوتے رہے ہیں نواب احمداللہ خاں میں خاندانی اعزاز کے سوا ذاتی صفات بھی اعلیٰ درجہ کی تھیں نہایت مہذب با اخلاق منکسر اور مسکین طبیعت کے تھے عہدِ انگریزی میں ان کے والد نواب مبارک علی خاں بہادر اور خود نواب احمداللہ خاں معزز عہدوں پر مامور رہے وہ نہایت نیک دل شخص تھے اور اخیر عمر میں انھیں نے گوشہ گزینی اختیار کی اور دن رات عبادت اور ورد وظائف میں مشغول رہے اور اسی حالت میں انتقال کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ و ۱۵ اپریل ۱۸۹۲ء

میر ضامن علی صاحب مرحوم

میر ضامن علی صاحب والدِ ماجد نواب محسن الملک مولوی سیّد مہدی علی بہادر نے نوّے برس کی عمر میں ساتویں مئی کو انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔
میر ضامن علی ساداتِ بارہ میں سے تھے اور مدّت سے اٹاوہ میں رہتے تھے اور نامی رؤسا اٹاوہ میں سے تھے۔ نہایت نیک، با اخلاق اور قابلِ ادب بزرگ تھے اس سے زیادہ خوش نصیبی کسی باپ کو کیا ہو سکتی ہے کہ ایسی لائق اور با اقبال اولاد جیسے کہ نواب محسن الملک اور ان کے دو بھائی ہیں چھوڑ کر دنیا سے کوچ کرے۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت　　مرگے کہ زندگان بدعا آرزو کنند

شیعہ اور سنّی دونوں فریق نے اپنے طریقہ پر جدا جدا اُن کے جنازے کی نماز پڑھی کیونکہ گو وہ شیعہ تھے مگر دونوں کو عزیز رکھتے تھے خدا دونوں فریق کو توفیق دے کہ اس تفرقہ کو دور کریں۔ محبت اہلِ بیت رسول دونوں فریق کا ایمان ہے صرف حماقتِ حمقاء ہے جس کے دور ہونے سے تفرق اُٹھ جاتا ہے۔ و اللہ من قال۔

لو کان رفضا حب آلِ محمد　　فلیشہد ان ثقلان انی رافضی

۷؍ مئی ۱۸۹۲ء

نواب عبداللطیف خاں مرحوم سی آئی ای

ہر ایک موجود کو ذاتِ باری کے سوا فنا لازمی ہے۔ زندگی تعجب کی بات ہے مگر موت کوئی عجیب چیز نہیں ہے ہاں پس ماندوں کے لئے ایک مصیبت ہے۔ یہ مصیبت بہت زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اُٹھ جاتا ہے اور جب کہ اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے تو یہ مصیبت بہت ہی زیادہ سخت ہوتی ہے۔

مسلمانوں کیلیے اور خصوصًا مسلمانانِ بنگال کے لئے بہت سخت مصیبت ہے کہ دسویں جولائی ۱۸۹۳ء کو نواب عبداللطیف خاں بہادر سی آئی ای نے اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نواب عبداللطیف خاں مسلمانوں میں نہایت نامی و گرامی معزز تھے مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی رفاہ و فلاح کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں کے لیڈر اور ان کے سرپرست تھے انجمن مذاکرہ علمیہ کلکتہ کے بانی تھے جو نہایت شان و شوکت سے برسوں تک قائم رہی۔ سالہائے دراز تک عہدۂ ڈپٹی مجسٹریٹی پر مامور رہے اور اسی عہدہ سے پنشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک ریاست بھوپال میں وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ حکام انگریزی ان کی بہت قدر و عزت کرتے تھے۔ اکثر والیانِ ریاست ہندوستان سے ربط و اتحاد رکھتے تھے غرضیکہ ایک ایسے عالی رتبہ اور فلاح خواہ قوم تھے جن کے انتقال سے قوم کو بہت کچھ نقصان پہنچا ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے پس ماندوں کو صبر جمیل عطا کرے اور اُن کی لائق و فائق اولاد کو سلامت رکھے اور جس طرح نواب مرحوم قوم کی بھلائی کے کاموں میں مصروف تھے اُن کی اولاد کو بھی ویسا ہی کرے۔

و ۱۰ر جولائی ۱۸۹۳ء

میر محمد حسین مرحوم

افسوس ہے کہ میر محمد حسین صاحب ایم آر اے سی سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ کاغذات دیہی وزراعت ممالک مغربی و شمالی وحال ڈائرکٹر محکمۂ زراعت و تجارت مملکت ہز ہائنس نظام نے علی الصباح ۵ بجے دن کو بتاریخ ۱۶ ماہ حال کو اس دارفانی سے انتقال کیا۔ مرحوم سترہ مہینے سے بخار میں مبتلا تھے اور بالآخر پھوڑے نکل آئے تھے ۱۶ کو تجہیز و تکفین بھی ہو گئی۔

مرحوم نہایت نیک اور خوش اخلاق اور اپنے دوستوں کے ساتھ محبت رکھنے والے تھے ان کے دوستوں کو ان کے انتقال کا نہایت افسوس ہے۔

و ۱۶ر جون ۱۸۹۳ء

وفات وزیرالدولہ مدبرالملک خلیفہ سیّد محمد حسن خاں بہادر
وزیر ریاست پٹیالہ

کوئی رنج اور کوئی غم اور کوئی مصیبت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جتنی کہ اس واقعہ جانکاہ سے ہوئی ہے کہ دسویں جنوری ۱۸۹۵ء کو سوا گیارہ بجے جناب مرحوم و مغفور وزیرالدولہ بہادر نے دفعتًا انتقال کیا یہ حادثہ دل کی بیماری کے سبب واقع ہوا۔

جن اوصاف سے جناب ممدوح موصوف تھے وہ آفتاب سے زیادہ روشن ہیں مگر جو کہ محبت و نیاز مندی ہم کو ان کی خدمت میں تھی اس وجہ سے ہم کو ایسا صدمہ و رنج ہوا ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا ہو ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس صدمہ سے ان کے خاندان اور ان کے برادر عزیز خلیفہ سید محمد حسین پر کیا صدمہ گذرا ہوگا۔ ان کا انتقال کرنا ملک کے لئے ہماری قوم کے لئے اور خصوصًا ریاست پٹیالہ کے لئے بہت ہی سخت صدمہ ہے مگر ایسے واقعات میں کسی کا کیا چارہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدا ان کی مغفرت کرے اور پس ماندوں کو صبر دے۔ ان دنوں میں مدرسۃ العلوم میں تعطیل ہے سولہویں جنوری کو مدرسہ کھلے گا اور پھر اسی وقت جناب ممدوح کے بطور نشان غم کے بند ہو جاوے گا اور اس دن کوئی طالب علم کس قسم کا کھیل نہیں کھیلے گا افسوس ہمارا ایک مخدوم اور محتشم دوست اور ہمارے کالج کا بہت بڑا سرپرست دنیا سے اُٹھ گیا۔

و ۱۰ جنوری ۱۸۹۵ء

راجہ شیوا پرشاد بہادر سی۔ ایس آئی

ہم کو اس خبر کے سُننے سے نہایت افسوس ہے کہ راجہ شیوا پرشاد بہادر سی ایس آئی نے بائیسویں مئی ۱۸۹۵ء کو بوقت شب اس جہان سے انتقال فرمایا۔ راجہ صاحب ایک نہایت مشہور اور نامور شخص تھے اور متعدد عہدہ ہائے سرکاری پر مامور رہے تھے اور لارڈ رپن کے زمانے میں وایسرائے کی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ ان کی لیف اور ان کی زندگی کی کارروائیاں اس قدر مشہور ہیں کہ تمام لوگ جواب زندہ ہیں، بخوبی واقف ہیں۔ زیادہ تر ان کی عمر کا حصہ تعلیم کے معاملات پر گزرا ہے۔ چند کتابیں بھی ان کی تصنیف کی بہت مشہور ہیں۔ نہایت نامی اور مشہور شخص تھے۔ ایسے مشہور اور نامی لوگوں کا دنیا سے اُٹھ جانا بلاشبہ افسوس و رنج کا مقام ہے۔ ایسی نام آوری حاصل کرنی جیسے کہ راجہ صاحب نے حاصل کی تھی نہایت مشکل اور دلیل ان کی نہایت لیاقت اور دانائی کی ہے۔ ہم سے اور ان سے نہایت پُرانی ملاقات تھی۔ انھوں نے ہمارے کالج میں بھی بعض شرطوں پر ایک ہزار روپیہ چندہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر خدا نے بہت جلد کالج کو ایسی ترقی دی کہ جو شرط انھوں نے کی تھی اس سے زیادہ ترقی کر گیا اور راجہ صاحب نے ہزار روپیہ چندہ کا ہم کو عنایت فرمایا۔ ان کی یہ مہربانی ہمارے کالج کی ہسٹری میں ہمیشہ یاد رہے گی۔ راجہ صاحب کا خطاب راجگی موروثی ہو گیا ہے اور ان کے بڑے بیٹے اس خطاب کے جانشین ہیں اور ہم کو اُمید ہے کہ مدت دراز تک وہ اس خطاب کی عزت سے معزز رہیں گے۔

و ۲۲ مئی ۱۸۹۵ء

زندگی اور موت

ایک خوبصورت جوان اپنے حسن و جمال پر مغرور جوانی کی امنگوں میں بھرپور پہاڑ پر بیٹھا ہے۔ خوشنما درختوں کا سایہ ہے۔ خوبصورت جانور درختوں کی ٹہنیوں پر دلفریب آواز سے چہچہا رہے ہیں۔ پانی کے چشمے پہاڑ سے نکل کر لہراتے جا رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے دنیا کو ہری ہری گھاس رنگ برنگ کے پھولوں سے بھرا دیکھتا ہے۔ میٹھی میٹھی ہوا سے ڈالیوں کا ہلنا گھاس کا لہرانا پھولوں کا جھومنا عجب مزا دکھاتا ہے۔ شام ہونے کو تھی۔ سورج افق کے کنارے پر پہنچ گیا تھا اس کی کرنیں لہراتے پانی میں گر کر رنگ برنگ کی لہریں دکھا رہی تھی اتنے میں شام ہوگئی اندھیرا چھا گیا وہ سب سماں آنکھوں کے سامنے سے جاتا رہا کہ دفعتاً اس کو موت یاد آئی طبیعت منغض ہوئی مگر دل میں کہنے لگا کہ ہم مرتے کیوں ہیں۔ ہم کو تو ہمیشہ رہنا چاہیئے جس درخت کے پھل کھانے سے خدا نے ہم کو منع کیا تھا وہ تو شجرۃ الخلد تھا جس کی نسبت ہمارے دشمن دوست نما نے کہا تھا ہل ادلّک شجرۃ الخلد وملک لا یبلیٰ

بس ہم نے اس کا پھل کھا لیا پھر مریں کیوں۔

اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں ہو گیا جو لطف سیر سے آ رہا تھا وہ کلفت سے مبدل ہو گیا بہت سوچا اور فکر کی کہ کیونکر اس باغ کو پاؤں اور اس میں جاؤں اور اس درخت کو دیکھوں۔ کوئی راہ نہ پائی۔ اس کے کان میں بھنک پڑی ہوئی تھی کہ دنیا میں ایک چشمہ آب حیات کا ہے اور اس میں بھی اسی درخت کی خاصیتیں ہیں۔ یہ سوچ کر اس چشمہ کی تلاش کے درپے ہوا اس کا پتہ سیاحوں سے پوچھا۔ انھوں نے تو دیوانہ سمجھا۔ مولویوں سے پوچھا انھوں نے کہا کہ ہاں ظلمات میں ایک چشمہ ہے سکندر گیا تھا پانی پینا نصیب میں نہ تھا مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ بتایا۔ نجومیوں کے پاس گیا انھوں نے کہا کہ یہ تو ہم بتا سکتے ہیں کہ تیری قسمت میں اسکا پانی پینا ہے یا نہیں مگر اس

کا پتہ ہم بھی نہیں بتا سکتے۔ اسی فکر میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک اونچے ٹیلے پر چند آدمی جمع ہیں آسمان کو ناپ رہے ہیں اور ستاروں کو دیکھ رہے ہیں سمجھا کہ ان سے ضرور میرا مطلب حل ہو گا۔ ان کے پاس گیا۔ وہ اس کی بات سُن کر مُسکرائے پر کچھ جواب نہ دیا اور اپنے کام میں لگ گئے وہ مایوس ایک کنارے جا کر چپکا بیٹھ رہا اتفاقاً وہاں قطب نما رکھا ہوا تھا اس نے دیکھا کہ ایک لوہے کا ٹکڑا ہل رہا ہے اور ہر پھر کر ایک ہی طرف اپنا منہ کر لیتا ہے۔ پہلے تو متعجب ہوا کہ بے جان لوہے میں کیونکر جان پڑی ہے۔ سوچ سوچ کر سمجھا کہ جس طرف یہ لوہا ہر پھر کر منہ کر لیتا ہے آبِ حیات کا چشمہ ہو نہ ہو اسی طرف ہے۔

یہ سوچ کر اس نے سیدھا شمال کا رستہ لیا۔ جنگلوں اور پہاڑوں دریاؤں کو جس طرح بناطے کرتا ہوا ایسی جگہ پہنچا جہاں سورج کا پتہ نہ تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اپنے دل میں کہا کہ مولویوں کا کہنا سچ تھا۔ اب میں ظلمات میں پہنچ گیا۔ یہیں آبِ حیات کا چشمہ ہے اِدھر اُدھر ڈھونڈھنے لگا اور سچ مچ ایک چشمہ مل گیا۔ اس کے کنارے پر ایک خوبصورت نازک اندام، سُرخ و سفید رنگت، رسیلی آنکھیں، نکھرے بال، زلفیں چھوٹی ہوئیں عورت کھڑی ہے۔ اِس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ بولی کہ میں زندگی ہوں۔ اس چشمہ کا پانی جس کو دیتی ہوں وہ مرتا نہیں۔ جوان نہایت خوش ہوا اور یقین کیا کہ میں آبِ حیات کے چشمہ پر پہونچ گیا۔ اس نازنین نے ایک گلاس چشمہ کے پانی کا بھر کر جوان کے ہاتھ میں دیا۔ وہ پینے ہی کو تھا کہ دوسری طرف نگاہ پڑی دیکھا کہ نہایت کریہہ منظر بدصورت کالی بھونڈی عورت کھڑی ہے جس کے تمام بدن پر مینڈھے کے سے بال ہیں۔ اسے دیکھ کر دہل گیا۔ پانی کا گلاس ہاتھ سے گر پڑا اور کپکپاتی آواز سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں موت ہوں۔

جوان ادھر زندگی کے حُسن و جمال پر فریفتہ اور ادھر موت کی ڈراؤنی صورت سے دہلا ہوا سناٹے میں کھڑا تھا کہ موت بولی تو مجھ سے کیوں ڈرتا ہے۔ یہ میری اصلی صورت نہیں ہے۔ یہ تو مجھ پر خول چڑھا ہوا ہے جس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ میں تو زندگی سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں یہ کہہ کر اس نے اپنا خول اُتار پھینکا۔ بوٹا سا قد، سڈول بدن، دلربا چہرہ، نک سک سے درست نکل آیا۔ اس کی خوبصورتی کے سامنے زندگی بھی شرمندہ ہوتی تھی۔ اس نے ایک سیب نکالا اور جوان سے کہا یہ لے اور اس کو سونگھ لے جوان خاموش تھا اور سوچتا تھا کہ پانی کا گھونٹ پی لوں یا سیب سونگھ لوں۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ غیب سے آواز آئی کہ ان دونوں

سے پوچھ کہ تم کہتی کیا ہو۔ پھر چاہے پانی کا گھونٹ پی اور چاہے سیب سونگھ۔

زندگی بولی کہ تمام دُنیا مجھ کو چاہتی ہے اور کسی حال میں موت کو نہیں چاہتی۔ دنیا کی ساری خوبی مجھ میں ہے۔ دل کی خوشی، آنکھوں کی روشنی، چہرہ کی چمک دمک۔ بدن کا جوبن۔ دل لبھانی ادا نا طقہ کی گویائی سب مجھ سے ہے۔ اگر میں نہ ہوں تو سب کچھ ہیچ ہے اور انسان مٹی کا اک ڈھیر ہے۔

موت بولی کہ تُو جس طرح میں نے اپنا خول اُتارا ہے تم بھی اپنا خول اتارو۔ یہ سُن کر زندگی کسمسائی مگر موت کے اصرار سے خول اتارا۔ اندر سے ایک کبڑی، ہونق، بے ڈول چڑیل نکلی سیاہ رو چہرہ اترا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری جس کو دیکھ کر جوان گھبرایا۔

موت نے کہا کہ دیکھ میری تو یہ اصلی صورت ہے اور زندگی کی اصلی یہ صورت ہے زندگی انسان کے لیے وبالِ جان ہے۔ کوئی دم ایسا نہیں کہ کسی نہ کسی رنج وغم میں نہ گذرتا ہو۔ کوئی دل ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی رنج نہ ہو۔ احتیاج اور خواہش اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور یہی دونوں ایک دم بھی اس کو چین میں رہنے نہیں دیتیں۔

کیا تو اپنے گورے گورے پنڈے اور اپنے خوبصورت چہرہ کو سمجھتا ہے کہ تو ہے۔ یہ تو، تو نہیں۔ یہ تو ایک پنجرہ ہے جس میں تو قید ہے خواہ شجرۃ الخلد کا پھل کھا اور خواہ چشمۂ حیات کا پانی پی یہ پنجرہ تو ایک دن ٹوٹے گا۔ پھر چاہے تو یہ سیب سونگھ اور اپنے اس پنجرہ سے خوش خوش پر پرزہ سے درست نکل آ اور ایسے خوشنما درخت کی ٹہنی پر جو کبھی تیرے خیال میں بھی نہیں گزرا جا بیٹھ اور ایسی آواز سے جو کسی کے کان نے نہیں سنی چہچہا خواہ اسی قید میں رہ اور اس وقت کا انتظار کر جب آنکھیں پتھراویں گی اور سیاہی و سفیدی ایک سی ہو جاوے گی۔ روشنی پر اندھیرا چھا جاوے گا۔ اور دم گھُٹ کر نرخرے میں آجاوے گا۔ کہیں گے کوئی دم ڈالنے والا ہے اور کچھ جواب نہ ملے گا۔ پھر ایک پنڈلی کو دوسری پنڈلی پر لپیٹے گا اور کہے گا کہ ہائے چلا یہی تیرا حال ہوگا اگر تو اس مکار چڑیل سے جو زندگی ہے محبت رکھے گا۔

جوان بولا اے میری مہربان ماں۔ موت۔ افسوس کہ میں ایسی مکار چڑیل زندگی کو ڈھونڈتا پھرا اور تجھ سی مہربان ماں کو جو بن ڈھونڈے ملتی ہے اور بن بلائے آتی ہے بھول گیا۔ مگر اب میں سمجھا کہ مجھے تیری ہی گود میں کھیلنا ہے اور جہاں تو لے جانا چاہتی ہے

وہی ہمارا دیس ہے مگر نہ معلوم ہونے سے پردیس سا ہے اور اسی سبب سے جھجک ہے اور ہاں کسی قدر اس کا بھی کھٹکا ہے کہ جو ہمارے ساتھ نہ چلے اور ہم سے پیچھے رہ گئے ان کا کیا حال ہوا۔

موت نے کہا کہ پیچھے رہ جانے والوں کا ذکر نہ کر۔ دو چار دن بعد سب اچھے ہو جاتے ہیں چلنے والا ہی چل بستا ہے۔ ہاں تو اپنے دیس کو نہیں جانتا مگر یہ دیس تو تیرا نہ تھا بلکہ اس پنجرہ کا دیس تھا جس میں تو قید ہے جیسے تیرا پنجرہ ہزاروں آلائشوں سے ناپاک ہے ایسا ہی اس کا دیس بھی ہے مگر جب تو آلائشوں سے پاک ہو کر اپنے دیس میں جاوے گا تو وہ دیس بھی تمام آلائشوں اور ناپاکیوں سے پاک ہوگا۔ پھر مبارک ہے تو اور تیرا دیس۔

جوان نے یہ سُن کر سیب لیا اور سُونگھ کر اپنے دیس میں چل دیا جو پیچھے رہ گئے وہ رونے پیٹنے لگے۔ موت ہنسی اور کہا جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب رونے سے کیا ہوت۔

کل من علیھا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

مرثیہ مصائبِ اُندلس

ہم نے اپنے پچھلے پرچہ میں پلیوتا میں جو مصیبتیں پڑیں اُن کا کچھ ذکر لکھا تھا جس سے پتھر دل بھی پگھل گئے ہوں گے اور جس سے ترکوں کی بہادری کا اور اس مصیبت کا جس کو اُنھوں نے برداشت کیا، لوگوں کے دل پر نقش کالحجر ہو گیا ہو گا۔ یہ مصیبت جو واقع ہوئی کچھ نئی نہیں ہے۔ اسپین یعنی اُندلس کے واقعہ میں اس سے بھی زیادہ سخت مصیبتیں گذر چکی ہیں۔ یہ دونوں دردانگیز مصیبتیں نتیجہ اس بات کا ہے کہ اسپین کے عربوں اور تُرکی کے ترکوں نے اپنے تئیں زمانہ کے لائق نہیں کیا تھا۔ زمانہ روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا اور وہ اپنے پچھلے خیالوں؛ اور قدیم عادتوں اور زہر آلود تعصبوں میں پھنسے پڑے تھے۔ جو لوگ زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ وہ نکل گئے اور یہ کیچڑ میں پھنسے پڑے رہے اور سسک سسک کر جان دی۔

یہ بات کچھ اُندلس کے گزشتہ واقعہ پر موقوف نہیں ہے۔ جہاں جہاں مسلمان قومیں یا مسلمان حکومتیں اب موجود ہیں، ان سب کا یکساں حال ہے۔ مصر کی حکومت کو دیکھو، کیسی ابتر حالت میں ہے۔ ایران کو دیکھو، جس میں ایک دو قدم چلنے کو امن کا راستہ نہیں ہے اور اس کی زندگی یا موت، روسیوں کی خفگی اور مہربانی پر منحصر ہے۔ کابل اور وسطِ ایشیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو دیکھو کہ وحشی جانوروں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ اِسی طرح اقوام کا حال ہے جو قوم جس ملک میں ذلت کے گڈھے

میں گرتی ہے جب تحقیق کرو، کہ وہ کون ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام بدعادتوں اور لغو خیالات اور غلط اوہام اور بے ہودہ تضیع اوقات اور اصراف و قرض اور مفلسی و فاقہ کشی میں مبتلا، جب دریافت کرو کہ کون ہیں، تو معلوم ہوگا کہ مسلمان، جب پوچھو کہ خود اپنی قوم کا دشمن، خود، اپنی قوم کی بھلائی کے کاموں کا مخالف، خود اپنی قوم پر آپ حد کرنے والا خود اپنی قوم کی بھلائی سے بے خبر خود اپنی ذاتی غرض کے لئے تمام قوم کا خوں بہانے والا۔ اور سب سے اخیر یہ کہ مدرستہ العلوم مسلمانان کا مخالف کون ہے تو جواب ملے گا کہ مسلمان شخصے از بزرگے گفت کہ ایں مردکہ یزید عجب سنگدلے بود کہ خونِ امام حسین را بہ ناحق ریخت بزرگ گفت بابا حسین نیست ورنہ بسیارے از یزید ہم سنگدل تو موجود ند۔ پس ایسی قوم پر جو جو مصیبتیں اور ذلتیں واقع ہوں کچھ تعجب نہیں ہے۔

جب اسپین میں مسلمانوں کی شکست ہوئی اور ہزاروں مسلمان مارے گئے اور لونڈی و غلام بنا کر بیچے گئے اور وہ سلطانی محل جنمیں وہاں کے خلیفہ نہایت شان و شوکت سے رہتے تھے ویران ہو گئے اور وہاں کی نہروں اور سلسبیل کی مانند بہتے ہوئے چشموں میں آنسو تک بھی نہ رہا اور تمام فوارے چپ ہو گئے اور وہ عالی شان مدرسے جس کے طالبِ علم اس زمانے میں تمام دنیا یورپ و ایشیا میں امتیاز رکھتے تھے نیست و نابود ہو گئے اور تمام اہل علم جنہوں نے عمدہ عمدہ علوم کے ایجاد میں نام پیدا کیا تھا اور دنیا کو فائدہ پہنچایا تھا یا مارے گئے یا قید ہوئے یا جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ گئے اسی ہنگامے میں سید یحییٰ قرطبی اندلسی بھی جو ایک نہایت بڑا عالم اور بے نظیر شاعر تھا قید ہو گیا تھا جب وہ چھوٹا تو مسلمانوں کی تباہی پر بہت رویا اور ان کے ماتم میں ایک مرثیہ لکھا جس کو معہ اس کے ترجمہ کے ہم اپنے اخبار میں لکھتے ہیں۔ اس کی بے نظیر فصاحت اور بلاغت اور سادگی الفاظ اور مضامین دردانگیز سے ہم کو اس واقعہ سے عبرت پکڑنی چاہیے جو اس میں مذکور ہے اور ہماری قوم کو غور کرنا چاہیئے کہ یحییٰ قرطبی نے کیا کیا اور ہم کیا کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں اپنے ہم عصروں کو روتا تھا۔ ہم اس زمانے میں اپنی قوم پر روتے ہیں۔ ہم میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ اس بات کو روتا تھا جو ہو چکی تھی اور ہم اس بات کو روتے ہیں جو ہماری قوم پر ہونے والی ہے وہ مُردوں پر روتا ہے ہم زندوں پر روتے ہیں۔ وہ بے جان لاشوں کا مرثیہ پڑھتا تھا ہم ان لاشوں پر مرثیہ پڑھتے ہیں جو جاندار ہو کر بے جان ہیں۔ یا لیت قومی یا لیت قومی مرثیہ مذکورہ یہ ہے۔

ترجمہ مرثیہ ؛

ہر چیز جب پوری ہو چکتی ہے تو پھر گھٹتی ہے۔
پس چین چاں پر کسی کو گھمنڈ کرنا نہ چاہیئے۔
یہی حالات ہیں جیسے کہ دیکھتے ہو کہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔
جس کو تھوڑی مدّت تک خوشی ہوئی تو مدتوں تک مُصیبت سہی۔
اس شدنی دنیا کی خوبیاں کبھی باقی نہیں رہتیں۔
اور نہ یہ دنیا ایک حال پر رہتی ہے اس کا یہی سبھاؤ ہے۔
زمانہ تمام عیشوں کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔
جب کہ تلواریں اور نیزے بھی ان کے پھاڑنے سے تھک جاتے ہیں۔
اور ہر تلوار فنا ہی کرنے کو کھینچتی ہے ـــــ پھر
ابن ذی یزن ہی کیوں نہ ہو اور عمدان کے محل ہی کیوں نہ ہوں
کہاں ہیں وہ یمن کے تاج والے بادشاہ
اور کہاں ہیں اُن کے وہ جڑاؤ تاج
اور کہاں ہے وہ شداد کا آراستہ کیا ہوا باغِ ارم۔
اور کہاں ہے فارس میں وہ ساسانی بادشاہوں کی حشمت۔
اور کہاں ہے وہ سونا جس کو قارون نے جمع کیا تھا۔
اور کہاں ہیں عاد و شداد و قحطان
سب پر وہ بات آئی جس کو کوئی ٹال نہ سکتا تھا
یہاں تک کہ ہو چکے پھر گویا کہ وہ سب تھے ہی نہیں۔
اور وہ بادشاہت اور وہ بادشاہ ایسے ہو گئے۔
جیسے کہ خواب دیکھنے والا اپنے خواب کو بیان کرے۔
دارا پر اور اس کے قتل کرنے والے پر زمانہ گزر گیا
کسریٰ بھی چل دیا اور اس کے محل نے اس کو نہ بچایا۔
گویا سبا کو کچھ بھی نعمت میسّر نہ ہوئی تھی۔

ایک دن بھی۔ اور سلیمان دنیا میں کسی چیز کا بھی مالک نہ تھا۔
پس دنیا میں طرح بہ طرح کی مصیبتیں ہیں۔
اور زمانہ میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی ہیں
اور مصیبتوں کے لئے تسلی دینے والے ہیں جن سے وہ ہلکے ہو جاتے ہیں
مگر مسلمانوں پر جو مصیبت پڑی اس کا کوئی تسلی دینے والا نہیں۔
برباد کر دیا آفت نے جزیرۂ اندلس کو جس کی کوئی ماتم پرسی بھی نہیں کر سکتا۔
اس غم میں اُحد کا پہاڑ جھک گیا اور شہلان کا پہاڑ ٹکڑے ہو گیا۔
یہاں کے مسلمانوں کو نظر لگ گئی پھر مصیبت ڈالی گئی
یہاں تک کہ مسلمانوں سے ملک کے ملک اور شہر کے شہر خالی ہو گئے۔
بلنسیہ کو پوچھ اور دریافت کر کہ مرسیہ کا کیا حال ہے۔
کہاں ہے قرطبہ اور کہاں ہے جیان
کہاں ہے حمص اور کہاں ہیں وہاں کے سیر و تماشے
کہاں ہیں اس کی میٹھی لبریز بہتی ہوئی نہریں
اسی طرح کہاں ہے طیلطلہ اور اس کا دارالعلوم یعنی مدرسۂ عالیہ
جس میں بہت سے فاضلوں کی شان بہت بلند تھیں۔
کہاں ہے غرناطہ جو دارالجہاد تھا ــــ کتنے
اس میں شیر تھے اور وہ لڑائی میں عقاب تھے
کہاں ہے وہ بلند لعل محل جس کا نام حمرا تھا اور اس کی آراستگی
گویا کہ وہ بہشت کے باغوں میں جنتِ عدن کی مانند تھا
کہاں ہیں اس کے وہ ستون جو شہروں کے ستون تھے ــــ پھر
کیوں کر نہ رونا آوے جبکہ وہ ستون نہ رہیں۔
اور کہاں ہے وہ پانی جو محل کے صحنوں میں بہتا تھا
اور اس کی نالیوں کو کلیوں کی جھمکوں اور پھولوں کے گچھوں نے ڈھانک رکھا تھا
اور کہاں ہیں اس کی میٹھی نہروں کی لہریں یاد دلاتی تھیں۔
ہند کی بنی ہوئی تلواروں کو جب کہ وہ میدان میں چمکتی ہیں۔

کہاں ہے اس کی وہ مشہور جامع مسجد جس میں بہت سی سورتیں پڑھی جاتی تھیں۔
ہر وقت میں قرآن کی آیتیں اور بہت ہے قرآن
کہاں ہیں اس کے وہ عالم جو جاہلوں کو ہدایت فرماتے تھے
اور کہاں ہیں اُس کے وہ مدرس جو علم میں نکتے بیان کیا کرتے تھے
کہاں ہیں وہ عابد و زاہد اللہ سے ڈرنے والے
جن کے رُخساروں پر خدا کے ڈر سے نہایت آنسوؤں کا طوفان برستا تھا
کہاں ہے وہ مالقہ کا بندرگاہ ۔ کہ کتنی
لنگر ڈالے کھڑی رہتی تھیں اُس کی وُسعت میں کشتیاں اور بیڑے
اور کہاں ہیں اس قدر ذہین شاعر جو اس میں رہتے تھے
اور کہاں ہیں وہ اس کے اہلِ ہنر جو دقیقہ رس اور سب چیز کے ماہر تھے
اور کہاں ہیں اس قدر اس کے سواد کی پاکیزہ سیر گاہیں
اور کہاں ہیں اس کے وہ پھولوں کے چمن اور باغیچے جن کے گرد نہریں بہتی تھیں
اور کہاں ہے اس کے پاس کا چمکتا ہوا قبہ
اور کہاں ہیں اے قوم وہ بہادر اور شہ سوار
اور کہاں ہے لبطہ زعفران کا گھر ۔ کیا
کسی نے خوبی میں اس کے مانند دیکھا ہے
اور کہاں ہیں وہ اتنے شجاع جو لڑائی میں بہادری کا گھمنڈ رکھتے تھے
ظاہر ہوئی جن کے لئے دشمنوں میں بہادری اور پلے درجہ کی
کہاں ہیں وہ اتنے بہادر جو اپنے ہاتھ سے کافر سے لڑے ۔ پھر دوسرے دن۔
ان کے مُلک میں گھر والے اور بچے اُن پر روتے ہیں
شہر و وادیاں صبح ہوتے ہی کُفر سے بھر گیا
اور اس میں خدا کی توحید شرک و نافرمانی سے بدل گئی
اسی طرح شہر مرسیہ بھی کُفر سے بھر گیا جو صالحین کا گھر تھا ۔ پھر کتنے
قطب غوث کے درجہ کے جن کی بڑی شان تھی اس میں تھے

روشن ابراہیمی دین افسوس سے روتا ہے۔
جس طرح عاشق معشوق کے چھٹنے سے رویا کرتا ہے
محرابوں کی روحیں روتی ہیں گو کہ وہ پتھر کی ہیں
یہاں تک کہ منبر بھی روتے ہیں گو کہ وہ لکڑی کے ہیں
اس ملک پر روتے ہیں جو مسلمانوں سے خالی ہو گیا
اور اجڑ گیا اور اب کفر اس کے لئے آرائش ہے
جو مسجدیں تھیں شام کو کنیسہ ہو گئیں
ان میں بجز ناقوس اور صلیب کے کچھ نہیں ہے
اے غافل تیرے لئے زمانہ میں بڑی نصیحت ہے
اگر تو سوتا ہے تو زمانہ جاگتا ہے
اے اکڑ کر چلنے والے اپنے وطن کی محبت میں
کیا حمص کے چھوٹنے کے بعد کوئی شخص کسی کے وطن چھوٹنے کا رنج کر سکتا ہے
اس مصیبت نے پچھلی مصیبتوں کو بھلا دیا ہے۔
اور یہ مصیبت بہت سا زمانہ گذرنے کے بعد بھی نہ بھولی جاوے گی
اے دبلے گھوڑوں کی گردنوں پر سوار ہونے والو
گویا کہ وہ گھوڑے کی دوڑنے کے وقت میں عقاب ہیں
اور اے ہند کی بنی ہوئی سان پر چڑھی ہوئی تلواروں کے اٹھانے والو
گویا کہ وہ رات کے اندھیرے میں شعلۂ آتش ہیں
اور اے وادی النخر کے آرام سے مویشی چرانے والو
جن کو اپنے وطن میں عزّت و دبدبہ ہے۔
آیا تمہارے پاس خبر پہنچی ہے اندلس کے حال کی
کہ بہت سے سوار رات کو وہاں کے لوگوں کی خبر لے کر چلے ہیں
کب تک وہاں کے عزیز لوگ فریاد کرتے رہیں گے ۔ اور وہ
قیدی ہیں اور مارے جاتے ہیں پھر کیا ان کے لئے کسی کا دل نہیں ہلتا

یہ کیا جھگڑا اسلام میں آپس میں ہے
اور تم تو اے خدا کے بندو آپس میں بھائی ہو
کیا غیرت والے ہمت والے نفس نہیں ہیں
کیا بھلائی پر مدد کرنے والے اور اعانت کرنے والے نہیں ہیں
ارے کوئی ہے اس قوم کی مدد کے لئے جو متفرق ہو گئی
ان پر کفر اور سرکشی نے غلبہ کر لیا ہے۔
کل رات کو وہ اپنے محلوں میں بادشاہ تھے
اور آج وہ کفار کی قید میں اُن کے غلام ہیں
کاش تو ان کو حیران و پریشان دیکھے کہ ان کے لئے کوئی رہنما نہیں ہے
ان پر ذلت کی رنگ برنگ کی پوشاک ہے
اگر تو ان کے فروخت ہوتے وقت انکار دنا سنے
تو سب کام چھوڑ بیٹھے اور تجھ کو رنج توڑ دیں
اے خدا کس طرح بچے اور مائیں ایک دوسرے سے جدا ہوئی ہیں
جس طرح روحیں بدنوں سے جدا ہوتی ہیں
افسوس کیسی نازنین عورتیں جن کو آفتاب نے بھی نہ دیکھا تھا
گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان کی مانند تھیں
جن کو بے رحم ذلت سے قید کر کر گھسیٹتے لئے جاتے ہیں
اور انکی آنکھیں روتی ہیں اور دل جلتا ہے
ایسی حالتوں کے صدمہ سے دل پگھل جاوے گا
اگر دل میں اسلام و ایمان ہو گا
ہے کوئی شخص جہاد کا طالب — پھر بے شک
اس کے لئے جنت الماویٰ آراستہ ہے جس کی بڑی شان ہے
اور حور و غلمان جنت سے انکی طرف دیکھ رہے ہیں
اپنی جان کی قسم کہ اس نعمت تک بہادر پہنچے ہیں
پھر رحمت ہو اللہ کی ان پر جو برگزیدہ ہیں مضر کے قبیلہ سے
جب تک کہ چلتی رہے ہوا اور ہلتی رہیں ٹہنیاں

حواشی

مولانا محمد قاسم نانوتوی: مولوی محمد ہاشم نانوتوی کے بیٹے مولوی محمد قاسم ۱۸۳۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ سرسید کے استاد مولوی مملوک علی سے انھوں نے درسی کتابیں پڑھیں۔ حدیث کی سند شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حاصل کی اور باطنی تعلیم مہاجر مکی حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں رہ کر پائی۔ کچھ دنوں دہلی کالج سے متعلق رہے۔ بعد میں مطبع احمدی میں تصحیح کتب کا کام انجام دیا۔ سرسید کے حلقے کے ایک رکن مولوی ممتاز علی کے پریس میں بھی کچھ دنوں کام کرتے رہے۔ علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی کی تاسیس، کے دو سال بعد جب مدرسہ دیوبند قائم ہوا تو اس کی سرپرستی فرمائی اور اس مدرسہ میں انھوں نے درس و تدریس کا کام اس لگن سے انجام دیا کہ وہ ایک تحریک کا پیش خیمہ بن گیا۔ عوام میں مولانا قاسم صاحب کی شہرت ان مباحثوں سے ہوئی جو انھوں نے عیسائی اور آریہ سماجی مبلغوں سے کیا۔ مولانا کئی مسائل میں سرسید سے اختلاف رکھتے تھے ان کا رسالہ "تصفیۃ العقائد" انھیں مسائل پر روشنی ڈالتا ہے سرسید مسلمانوں میں دین اور سائنس کے امتزاج کے محرک اول تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مغرب کی تازہ ہواؤں سے ان کے ہم کیش بہرہ مند ہوں جب کہ مولانا اس سے مسلمانوں کو محفوظ و مصئون رکھنا چاہتے تھے لامحالہ دونوں کے طریق کار میں بعدالمشرقین پیدا ہوا لیکن سرسید کی فکر کی بنیاد کشادگی اور فراخ دلی پر تھی اس کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب مدرسہ دیوبند کی پہلی رپورٹ سرسید کو موصول ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں "دیوبند ایک چھوٹی سی بستی ہے کوئی بہت بڑا نامی گرامی شہر نہیں مگر اس کے باشندوں کی عالی ہمتی اور نیک نیتی کو دیکھ کر بڑے بڑے مشہور شہروں پر اس کو فوق دینا واجب ہے.... مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس خلف مولانا مملوک علی صاحب مرحوم اور مولوی محمد محمود صاحب دیوبندی کی محنت اور توجہ

ازبس قابلِ تحسین اور آفریں کے ہے کہ ان کی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی تعداد اور استعداد ظہور میں آئی اور مدرسوں مولوی محمدؐ فاضل اور مولوی میر یار خاں اور مولوی فتح محمدؐ و حافظ احمد حسن نے بھی نہایت سرگرمی سے اپنا کام انجام دیا۔ ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں مولوی محمدؐ قاسم نانوتوی نے بمشمول مولوی مہتاب علی اور مولوی ذوالفقار علی صاحب کے نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔ ایک اور تحریر میں منتظمین مدرسہ دیوبند کو مشورہ دیتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں "ضرور ہے کہ منتظمانِ مدرسہ اس نظیر کو اختیار کریں جو مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ میں برتی جارہی ہے جہاں باہم طالب علموں اور استادوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہونے پاتا کہ وہ کون کون سے طالب علم ہیں جن کے اخراجات کی کفالت کمیٹی کی طرف سے ہوتی ہے، اور اگر ایسا اہتمام بلیغ ممکن نہ ہو تو اس قدر تو ضرور کر دینا چاہیئے کہ یہ یقین باقی نہ رہے کہ کس طالب علم کو کس کے ہاں سے کھانا ملتا ہے سب کھانا ایک جگہ آجایا کرے اور سب طالب علم مل کر ایک جگہ کھایا کریں اور سالانہ رپورٹوں میں سے یہ اسم وار فہرستیں برائے خدا خارج کی جاویں۔ ہم اس مدرسے کی دل سے قدر کرتے ہیں اور جس نیک نیتی اور قومی ہمدردی اور استقلال خاطر کے ساتھ اس کی کارروائی ہوتی ہے وہ نہایت شکرگزاری کے لائق ہے اور امید ہے کہ جس نقص کا ان چند سطروں میں ذکر کیا گیا ہے وہ بھی آئندہ باقی نہ رہے گا۔"

---

۱ احمد علی: مولانا محمدؐ زکریا صاحب لکھتے ہیں "حضرت مولانا حافظ احمد علی صاحب محدث سہارنپوری جن کے تقدس و کمال کے آوازہ سے ہندوستان گونج رہا ہے اپنے علائق قطع کر کے وطن میں گوشہ نشیں ہوئے اور ایام عزلت میں مدرسہ کی سرپرستی کا بار اپنے دوش پر اٹھایا اور اپنے آخر زمانۂ حیات تک ایک خاص بڑی جماعت کو مدرسہ کی مسجد میں بٹھا کر صحاح ستہ حدیث کا درس دیا۔ شیخ اکرام نے لکھا ہے کہ مولانا احمد علی "اپنے زمانے میں علم حدیث کے امام سمجھے جاتے تھے۔ پہلے ہندوستان میں حدیث پڑھی پھر ۱۲۶۱ھ میں مکۂ معظمہ جا کر حضرت مولانا شاہ محمدؐ اسحاق سے دوبارہ پڑھی اور سند و اجازت حاصل کی۔ علاوہ درس و تدریس کے مولانا سہارنپوری کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے اور چھاپ کر عام کیا۔ مولانا شبلی نے چند روز آپ سے حدیث شریف کا درس لیا۔"

دیانند سرسوتی: لالہ لاجپت رائے لکھتے ہیں سوامی دیانند یعنی مول شنکر ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے ایک برہمن گھرانے میں قدامت پسند طرز کی تعلیم حاصل کر کے انھوں نے ۱۸۴۶ء میں گھر بار چھوڑ دیا ۱۸۴۸ء میں وہ باقاعدہ سنیاسی ہو گئے ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۳ء تک متھرا میں وِرجانند سے ہندوستانی کلچر سے متعلق اپنے علم کو دہراتے رہے یہیں انھیں ایک مشن کا احساس ہوا مکس مولر کا خیال ہے کہ سوامی دیانند نے اپنے ملک کے مذہبی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور ان بدعتوں کے وہ مخالف تھے جن کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ ہندوستان میں مذہبی نشوونما کے بعد کے دور میں ہندو مذہب میں داخل ہو گئی تھیں اور جن کا برہمنوں کے مقدس ویدوں میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ بنارس اور دوسرے مقامات پر عالم پنڈتوں کے ساتھ عام مباحثوں میں عام طور پر انھیں فاتح سمجھا جاتا تھا اگرچہ ان کے مغلوب دشمنوں کے حملوں سے انھیں بچانے کے لئے اکثر پولیس کی مدد طلب کرنی پڑتی" سوامی دیانند آریہ سماج کے بانی تھے۔ اس تحریک کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں رکھی گئی لیکن اس کو عملی کامیابی پنجاب اور مغربی یوپی میں ملی۔ راجستھان میں مہارانا اودے پور اور مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ ان کے شاگرد ہوئے لالہ لاجپت رائے لکھتے ہیں کہ دیانند نے بند کے ماضی کو جس طرح پیش کیا اس کی بدولت آریہ سماج ایک اجیائی ادارہ بن گیا جس سنہرے زمانہ کی انھوں نے تصویر کشی کی وہ یقیناً افسانۂ ماضی تھا مگر خود انھیں یقین تھا اور انھوں نے لاکھوں کو یقین دلایا کہ یہ سنہرا زمانہ پھر واپس آسکتا ہے" عبداللہ یوسف علی کا خیال ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی خدا کی وحدت کا اُپدیش دیتے تھے اور بت پرستی کے مخالف تھے! اس لئے سرسید کی رائے ان کے بارے میں اچھی تھی۔ سوامی جی جب ۱۸۷۷ء میں وائسرائے لارڈ لٹن کے دربار میں شریک ہوئے تو وہاں اُن سے سرسید سے ملاقات ہوئی۔ اُردو کے مشہور کہانی نویس منشی پریم چند پر بھی آریہ سماج کا گہرا اثر تھا۔ ہندی کے ممتاز نقاد پروفیسر شلیش زیدی کا خیال ہے کہ ان کی بعض کہانیوں پر آریہ سماج تہذیبی، شعور کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

کیشب چندر سین: کیشب چندر سین ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے وہ برہمو سماج کے مشہور مبلغ تھے انھوں نے برہمو سماج کو ایک زیادہ مقبول اور عالمگیر رنگ میں پیش کیا عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ ہندو چاہتے تھے کہ ذات پات کی قیود اور بچپن کی شادی کے دستور کو موقوف کر دیا جائے۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی کے اصول کو رواج دیا جائے۔ حضرت

مسیح اور انجیل اور نبی کریم اور اسلام کی تعلیم کا اعتراف کیا جائے یہ تھے وہ اصول جن کی آواز کیشب چندر سین نے بلند کی۔"

مولانا محمدؐ مظہر: حافظ لطف علی کے بیٹے مولانا محمد مظہر نانوتوی ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے مولانا مملوک علی سے درسی کتابیں پڑھیں اور شاہ عبدالغنی سے علم حدیث کا درس لیا۔ مولانا سعادت علی نے ایک عربی مدرسہ سہارنپور میں قائم کیا تو اس کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے مولانا محمد زکریا صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی محمدؐ مظہر صاحب نانوتوی کے علمی تبحر اور انتظامی کمال نے مدرسہ کو ادنیٰ مکتب ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ مدرسہ بنادیا۔" مولانا مظہر صاحب نے جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔

حافظ محمدؐ اکبر: مولوی محمد نورالحسن کے بیٹے حافظ محمدؐ اکبر ۲۶ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ کو پیدا ہوئے درسی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے علوم متداولہ کی تکمیل کی دیوان حماسہ اور مقامات حریری پر مختصر اور جامع حواشی لکھے اُن کا مولانا رشید احمد گنگوہی سے بعض مسائل میں اختلاف رہا اور جانبین میں طویل خط و کتابت ہوئی۔ حافظ محمد اکبر کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں "ایک اور ہمارے دوست ان سے بھی (مشتاق حسین سے) زیادہ کٹے حاجی حافظ مولوی محمدؐ اکبر صاحب ابن جناب مولانا و مرشدنا حاجی حافظ مولوی محمدؐ نورالحسن صاحب مرحوم نوراللہ مرقدہٗ ہیں جو اس ہیچ میرز کو عم بزرگوار کہتے ہیں مگر حقیقت میں ہندی محاورہ میں چچا بناتے ہیں اور مدرستہ العلوم میں مدرسہ اور بورڈنگ ہوس کے مہتمم ہیں یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ کو کافر جانتے ہوں گے مگر میرے حال پر افسوس تو بہت کرتے ہوں گے ان سے کہا ہوں کہ اجی مولوی جی کوئی مضمون تو تم بھی تہذیب الاخلاق کے لئے لکھدو وہ کچھ اچھا تو ہونے کا نہیں مولویانہ خیال کا ہوگا۔ بھلا تہذیب الاخلاق میں برکت تو ہوگی۔ ہاں ہوں کرتے ہیں خدا نے چاہا کبھی ان کا مضمون بھی چھپے گا۔

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی : مولانا عبدالحلیم کے بیٹے مولانا عبدالحیٔ ۱۸۴۷ء میں باندا میں پیدا ہوئے، مولانا کا سلسلۂ نسب چوالیس واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے اجداد میں جید عالم ملا قطب الدّین شہید سہالی بھی ہیں جن سے ہندوستان کے بہت سے بلند پایہ علماء کا سلسلۂ استناد منتہی ہوتا ہے۔ اسی خاندان میں ملّا نظام الدین بھی پیدا ہوئے جو بانیٔ درسِ نظامی کی حیثیت سے مشہور ہیں مولانا عبدالحیٔ کے شاگردوں میں مولانا سلیمان پھلواروی حمیدالدّین فراہی عبدالحلیم شرر اور ظہیر احسن نیموی خاصے مشہور ہیں مولانا اڑتالیس سال جیے لیکن اس قلیل عرصے میں سو سے زیادہ تصانیف یادگار چھوڑیں۔

مفتی میر عبّاس : سید علی اکبر کے بیٹے مفتی میر عباس آخر ربیع الاول ۱۲۲۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اُن کے مورثِ اعلیٰ شوستر سے آئے تھے۔ سلسلۂ نسب سترہ واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ مفتی صاحب تفسیر، حدیث، فقہ کلام، منطق، فلسفہ طب، تاریخ، ہندسہ وہیئت معانی وبیان اور شعروادب کے اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا شبلی کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی میرانیس کے فرزند میر خورشید علی نفیس مولانا سید علی حسن جائسی علی گڑھ کالج کے شعبۂ قانون کے استاد سید کرامت حسین، عماد الملک سید حسین بلگرامی وغیرہ ہیں۔ میرانیس مفتی صاحب کے گہرے دوستوں میں تھے اور کہا جاتا ہے کہ مشکلاتِ فن شاعری میں وہ مفتی صاحب سے مشورہ لیتے تھے۔ مفتی میر عباس کی مرزا غالب سے مراسلت تھی اور غالب کے کئی خطوط ان کے نام ملتے ہیں۔ مختلف علوم میں مفتی میر عباس کی ایک سو بائیس کتابیں ملتی ہیں۔

پنڈت گوردت : پنڈت گوردت ایم۔اے آریہ سماج کے ممتاز مبلغوں میں تھے۔ ان کی عالمانہ تصنیف VEDIC TERMINOLOGY کا ذکر پروفیسر میکس مولر نے اپنی کتاب قدیم سنسکرت ادب کی تاریخ میں قابلِ قدر انداز میں کیا ہے۔

سیّد صِدّیق حسَن خاں: اولادِ حسن کے بیٹے نواب صدیق حسن ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو قنوج میں پیدا ہوئے مفتی صدرالدین آزردہ سے درسی تعلیم حاصل کی اور شیخ عبدالحق محدث بنارسی سے حدیث کی سند اور اجازت لی۔ بھوپال کی والیہ نواب شاہجہاں بیگم سے شادی کے بعد آپ نے امورِ سلطنت میں بھی حصّہ لیا لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا۔ آپ کی تصنیف و تالیف کی تعداد پچپن بتائی جاتی ہے۔

مولوی محمد حسن صادقپوری پٹنوی: خانوادۂ صادقپور کے مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے بیٹے شمس العلماء مولوی محمد حسن ذبیح پٹنہ میں پیدا ہوئے وہ طرزِ کہن پر اڑنے والے نہیں تھے اور جدید افکار کا خیر مقدم کرتے تھے انھوں نے خاندان صادقپور کے لڑکوں کو انگریزی تعلیم کی برکتوں سے آگاہ کیا اور اُن کے بے جا تعصبات کی طرف توجہ دلائی۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "وہ خود نہایت پکے وہابی یا موحد یا اہل حدیث تھے۔ ان کا عمل بہ تمامہ حدیث پر تھا کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ حدیث پر بھی بعد تحقیق عمل کرتے تھے علماء حدیث کے اقوال کی پیروی بھی کچھ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ غرضیکہ نہایت پاک اور پاک طینت اور سیدھے اور سچّے اور پورے مسلمان تھے اور بڑی خوبی یہ تھی کہ وہابیوں کا سا تعصب و تصلب اور سختی ان میں نہ تھی"۔ انھوں نے بہار میں مسلمانوں کا پہلا ہائی اسکول مخزن اینگلو عربک ہائی اسکول قائم کیا جو علی گڑھ کالج کے اصولوں پر استوار تھا، اس کے علاوہ پٹنہ انٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ "یہ ایک عمدہ پروگرام ہے اور ہم کمیٹی کی کامیابی چاہتے ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی مسلمانوں کو بہ نسبت اس کے زیادہ تر ضرورت ہو کہ ان کی پوشیدہ مستعدی اور قابلیت قوم کی ترقی کے واسطے کام میں لائی جاوے اور پٹنہ کی کمیٹی نے اس باب میں ایک عمدہ نظیر قائم کی ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل: شاہ عبدالجلیل کے بیٹے مولانا محمد اسمٰعیل ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے درسی کتابیں سرسید کے استاد مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے پڑھیں حدیث کی تعلیم مولانا قاسم نانوتوی سے حاصل کی۔ باپ کے انتقال کے بعد عیدگاہ اور جامع مسجد علی گڑھ کی امامت تفویض ہوئی۔ یہ علی گڑھ کے نامی گرامی عالم تھے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی کمیٹی مدبرانِ تعلیم اہل سنت جماعت کے ایک رکن تھے۔

چراغ علی : محمد بخش کے بیٹے چراغ علی ۱۸۴۴ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ مولوی چراغ علی کا میلان اسلام کی صحیح ترجمانی کی طرف تھا۔ یہی قدر مشترک انھیں سرسید کے قریب لے آئی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "جب سرسید لکھنؤ تشریف لائے تو مولوی صاحب ان سے ملنے کے لئے سیتا پور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدر آباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سرسید کے پاس آیا تو انھوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لے کر علی گڑھ آ گئے اور کئی مہینے سرسید کے پاس رہ کر اس کام کو بہ کمال خوبی انجام دیا جسکا معاوضہ کلی ریاست سے ان کو ملا ۱۸۷۷ء میں نواب سر سالار جنگ نے سرسید سے ایک لائق شخص طلب کیا انہوں نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدر آباد چلے آئے جہاں ان کو ایک اعلیٰ عہدہ ملا۔ اس سے پہلے وہ ضلع بستی اور صوبے کے دوسرے اضلاع میں معمولی سرکاری ملازم تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کی جدید کاری کا کام سرسید کے ساتھ چراغ علی نے بھی کیا ہے وہ ہندوستان کے چند فاضل ترین عالموں میں تھے۔ ان کی بیشتر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ ان کی کتاب تحقیق جہاد کے بارے میں شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ "جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس وقت وہابیوں کے مقدمات کی وجہ سے صادقپور پٹنہ کا وہ محلہ جو ہندوستان میں رد بدعت کا ایک بڑا مرکز تھا کھدواڈالا گیا تھا۔ کئی مخلص اور قابل آدمی قید خانوں اور کالے پانی میں زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ ہزاروں آدمی جہاد کے متعلق عام خیالات سے متاثر ہو کر اپنی جانیں ہلاکت میں ڈال رہے تھے نتیجہ یہ تھا کہ ایک تو کئی مخلص آدمی وہ طریقہ اختیار کر رہے تھے جس میں سراسر نقصان تھا۔ فائدے کا کوئی امکان نہیں اور دوسرے حکام بھی مسلمانوں سے بدظن ہو رہے تھے مولوی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک ایسا راستہ بتایا جو قوم کے لئے مفید تھا"، مولوی چراغ علی کی کتاب اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام جس کا ترجمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کیا ہے۔ جس میں اس خیال کو باطل قرار دیا گیا ہے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ مولوی چراغ علی کے اردو رسائل میں اسلام کی دینوی برکتیں، قدیم قوموں کی مختصر تاریخ، بی بی ہاجرہ، تعلیقات، بی بی ماریہ قبطیہ اور رسائل چراغ علی وغیرہ ہیں مذہبی فکر میں چراغ علی کو سرسید کا مثنیٰ کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا علم و فضل سرسید تحریک کو ایک مذہبی سطح پر لے آیا۔ مولوی چراغ علی کی وفات پر مولانا حالی نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی : شاہ اہل اللہ کے بیٹے مولانا فضل رحمٰن ۱۲۰۶ھ میں ملاواں میں پیدا ہوئے۔ فضل رحمٰن آپ کا تاریخی نام ہے۔ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس میں شریک ہوئے تھے اور شاہ محمد آفاق کی صحبت میں رہ کر طریقت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے زمانے کے آپ مشہور صاحب باطن بزرگ تھے مولانا علی میاں رقم طراز ہیں کہ "ایک روز مولانا محمد علی مونگیری سے مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی نے فرمایا کہ تم نے کوئی عشق کی دکان بھی دیکھی ہے۔ مولانا مونگیری نے سکوت کیا۔ آپ نے فرمایا ہم نے دو دو دکانیں دیکھی ہیں ایک شاہ غلام علی صاحب کی اور دوسرے حضرت شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی کہ اس دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا۔" کہا جاتا ہے کہ ایک شب رسول اللہ کو مولانا فضل رحمٰن نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرتؐ سرسید کے لئے جنت کی بشارت دے رہے ہیں۔

ایچ ایف۔ بلوک مین : بلوک مین ڈریسڈن میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے لیپزگ اور پیرس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج کی ملازمت اختیار کی اور ہندوستان آئے۔ ۱۸۶۰ء میں کلکتہ مدرسہ میں عربی اور فارسی کے استاد رہے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء تک ڈویٹم کالج میں ریاضیات پڑھاتے رہے۔ ۱۸۶۵ء میں کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل ہوئے یہیں انھیں عہد اکبری کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کلکتہ مدرسہ کے ناظم کی حیثیت سے سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد کا تعلق ۱۸۰۲ء تک رہا درمیان میں کچھ وقفوں کو چھوڑ کر خواجہ فریدالدین کا کلکتہ مدرسہ سے سرسید کی پیدائش کے بعد تک رابطہ رہا۔ قیاس ہے کہ انھیں دنوں مدرسہ میں ہندوستانی تاریخ سے دلچسپی کا آغاز ہوا۔ اپنے نانا کی تاریخ سے دلچسپی کا حال سرسید نے لکھا ہے۔ بلوک مین نے جب آئین اکبری کی پہلی جلد کا ترجمہ کیا تو اس میں ساری تصویریں سرسید کی مرتب کردہ، آئین اکبری سے اخذ کیں۔ ۱۸۵۵ء میں سرسید آئین اکبری کی تین جلدوں کی تصحیح کر چکے تھے جس میں کثرت سے تاریخی اور توضیحی حواشی کا اضافہ کیا تھا۔ دوسری جلد ایام غدر میں تیار ہو گئی۔ ۱۸۶۲ء سے سرسید کا کلکتہ برابر آنا جانا لگا رہا ۱۸۷۸ء میں تو وہ وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی تھے خیال ہے کہ اسی دوران ان کی ملاقات بلوک مین سے ہوئی۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں: ۱۸۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے نواب شمس الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے عربی ترکی اور فارسی میں اچھی دستگاہ تھی تاریخ جغرافیہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ایلیٹ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا لکھتے ہوئے فراہمی کتب اور ترجمے کے سلسلے میں اُن سے بہت مدد لی تھی۔ محدثین فقہا حکما اور شعرا کے حالات سے ان کو خصوصی واقفیت تھی۔ ان کو بگڑے ہوئے الفاظ اور اسماء کی اصل اور کتبہ دریافت کرنے میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ تیونس کے وزیر خیر الدین کی مشہور کتاب اقوام المسالک کا اُردو ترجمہ سرسید نے نواب ضیاء الدین احمد کی تحریک پر کرایا تھا کتاب کی آمدنی نواب صاحب نے مدرستہ العلوم کو نذر کر دیا تھا۔ وہ علی گڑھ تحریک کے ابتداء سے معاون و مددگار تھے سائنٹیفک سوسائٹی کے ممتاز ارکان میں تھے۔ وہ دہلی سوسائٹی کے بھی ممبر تھے اور وہاں کی علمی و ادبی زندگی کے روحِ رواں تھے شاعری میں غالب کے شاگرد تھے نیر درخشاں ان کا تخلص تھا۔

مدرستہ العلوم علی گڑھ کے چندہ کے لئے سرسید نے جب پنی ریڈنگ تھیٹر کی تجویز پیش کی تو نواب ضیاء الدین احمد کو پرستان کے بادشاہ کا رول دیا گیا تھا۔ اُن کی وفات پر حالی نے کہا

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبک طناز   آتے ہی خزاں کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبلِ زار   سو اس کی بھی کل سے نہیں آتی آواز

حکیم محمود خاں: حکیم صادق علی کے بیٹے حکیم محمود خاں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے حکیم محمود خاں اپنے زمانے کے طبیب حاذق تھے۔ وہ لالچ غرور خود نمائی سے کوسوں دور تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی لیکن خودداری اور عزتِ نفس کا بہت پاس تھا۔ خدمتِ خلق کا جذبہ بہت قوی تھا غدر کے زمانہ میں مخلوق خدا کی جو خدمت انھوں نے کی اس کے قصے زبانوں پر عام تھے۔ غالب لکھتے ہیں "سنہ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں جنوری کے مہینے میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر واپس آنے لگے اسی اثنا میں حاکمِ شہر کو چغل خوروں نے خبر دی کہ راجہ نرندر بہادر کے معالج حکیم محمود خاں کا مکان مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں چنانچہ ۲ فروری سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑے کر آ گیا اور مالک خانہ کو معہ ساٹھ آدمیوں کے پکڑ لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا لحاظ رکھا گیا بالآخر حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور اُن کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہو گئی"۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حکیم محمود خاں علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے مگر اس کے باوجود سرسید نے اور حالی نے حکیم محمود خاں کی خوبیوں کا نہایت کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے   واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے   کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جگا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گیا سیلِ فنا اس کو بھی اے دلی بہا

حافظ عبدالرحمٰن : حافظ عبدالرحمٰن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ حیرت تخلص تھا۔ سرسید کے دوست امام بخش صہبائی سے فنِ شاعری میں استفادہ کیا تھا اور طب کا علم حکیم احسن اللہ خاں دہلوی کے مطب میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء سے علی گڑھ سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ حافظ عبدالرحمٰن کے اہتمام میں چھپنے لگا تھا۔ سرسید کے بیٹے سید محمود کے اتالیق تھے صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ان کی تصنیف فارسی میں سفینۂ رحمانی کے نام سے مطبع نولکشور سے چھپی تھی اس کتاب میں سرسید کی شان میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں۔

ہرچہ گویم در ثنائش کمتر است — ذات او چوں ذات مہر انور است
کورِ باطن کے ببیند نورِ او — موسیٰ باید تا رود بر طور او
شمعِ تاباں بزمِ دینِ احمد است — رازدار طرز جد امجد است
بوستانِ دینِ احمد را گل است — گلشنِ عشقِ نبی را بلبل است

مولانا حالی لکھتے ہیں "حافظ عبدالرحمٰن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے استاد تھے پینتالیس[۵] برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا مرتے وقت اُنھوں نے محمود اور سرسید کو بلایا، جب دونوں کو دیکھ لیا فوراً روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو ان کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج و الم رہا۔" انھیں حافظ عبدالرحمٰن کا ایک لطیفہ منشی غلام نبی خاں کے حوالے سے حالی لکھتے ہیں "حافظ عبدالرحمٰن جو ۴۵ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی اُن کے ساتھ تھے اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلتِ تنخواہ کے سبب انکو اپنے پاس رکھتے تھے اُن سے اکثر ہنسی اور چہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا کرتے تھے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں آپ کا خط کیوں اچھا نہیں سید صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں پس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے۔"

ایک دن سید صاحب نے حافظ عبدالرحمٰن سے کہا بھلا صاحب اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُن کے ساتھ کرتے تھے بیان کئے کہ میں آپکی بڑی خاطر کروں دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں رات کو آپ کا پلنگ

اپنے پلنگ کے برابر بچھواؤں اور چپاں کروں اور چنیں کروں سید صاحب نے کہا کہ ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ مجھے کیا عہدہ دوگے؟ حافظ جی نے ذرا دکھی صورت بنا کر کہا حضرت میں مجبور ہوں چونکہ آپکا خط اچھا نہیں ہے اس لئے کوئی عہدہ نہ دے سکوں گا"۔

مرزا فتح محمد بیگ: مرزا فتح محمد بیگ موضع پٹی کے رئیس انجمن قصور کے آنریری سکریٹری تھے۔ افکار نو کی اشاعت کے لئے ۱۸۸۴ء میں جب سرسید پنجاب گئے تو لدھیانہ میں انھوں نے سرسید کا زبردست استقبال کیا۔ مولوی سید اقبال علی لکھتے ہیں "ہمدردی کا جوش خدا تعالیٰ نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ پنجاب میں میں نے اُن سے زیادہ کسی شخص کو قومی ہمدردی کے جوش میں بھرا ہوا نہیں دیکھا نہایت فصیح البیان آدمی ہیں اور بہت عمدہ عمدہ اور لمبے لمبے دلچسپ لفظوں اور دلچسپ لہجے سے اسپیچ دیتے ہیں۔ انجمن قصور کو ان کے سبب سے بہت کچھ رونق ہوئی ہے۔ ہر ایک قومی کام میں قلمی قدمے درمے سب طرح پر شریک ہوتے ہیں علی گڑھ میں بھی ایک دفع مع چند احباب کے تشریف لائے تھے اور مدرسۃ العلوم میں سید صاحب کی یادگار بنانے کی جو تجویز درپیش تھی اس میں نہایت عمدہ گفتگو کی تھی"۔

سیّد ظہور حسین: میر امداد حسین کے بیٹے سید ظہور حسین محلہ مغل پورہ مراد آباد میں پیدا ہوئے، الہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل اور سرسید کے دوستوں میں تھے سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے رکن تھے انھوں نے سوسائٹی کو ایک تارہ بین بطور ڈونیشن دیا تھا انھوں نے اپنی ساری جائیداد منقولہ علی گڑھ کالج کو نذر کر دیا تھا۔ سرسید ان کی وفات کے بعد انکے دوستوں کو ایک گشتی مراسلے میں لکھتے ہیں "سید ظہور حسین نہایت رحم دل تھے اور چھوٹے بچوں پر عموماً نہایت مہربانی اور رحمدلی کرتے تھے پس چھوٹی عمر کے لڑکوں کے رہنے کے لئے ان کی یادگار میں مکان بنانا نہایت مناسب ہوگا"، علی گڑھ کالج میں ظہور حسین گیٹ اور ظہور حسین وارڈ کی عمارت ان کی جائیداد منقولہ کی قیمت اور اُن کے دوستوں کی اعانت سے تعمیر کی گئی سرسید نے جب لندن کے لئے رخت سفر باندھا اور بنارس سے الہ آباد پہنچے تو لکھا کہ اگرچہ ہمارے محب دلی سید ظہور حسین صاحب بنارس میں ہم سے ملنے آئے تھے اور ہم سب کو رخصت کر چکے تھے مگر

عین اس وقت پر جب کہ مسٹر اسمائتھ صاحب کی محبت اور نشانی رخصت کا ذکر ہو رہا تھا ان کا آدمی پہنچا اور چاندی کی نہایت عمدہ ایک گھڑی مکیب کی دوکان کی میرے لئے بطور نشانی محبت کے لایا۔ تذکار محبت دوبالا ہو گئے اور ہر ایک شخص نے ایسے دل سے جو محبوں کی یاد سے مشتعل تھا اور چشم نم کے اس پر پانی چھڑکنے سے محبّت کا جوش اور بھی دھواں دھار ہو رہا تھا، ان کو اور تمام دوستوں کو یاد کیا"

سیّد رضا حسین : قاضی سید تفضل حسین کے بیٹے سید رضا حسین ۱۸۳۶ء میں موضع سائن پرگنہ حویلی بہار ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے قاضی صاحب کی تعلیم قدیم طرز کی تھی لیکن انھوں نے جدید تعلیم کی دستک سُن لیا تھا صوبہ بہار کے یہ ان بزرگوں میں تھے جنھوں نے اہل بہار کو جدید تعلیم کی طرف مائل کیا زمانۂ ملازمت میں ان کی بنارس میں آمد و رفت رہی یہیں ان سے سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہ اُن کے حلقہ کشش میں آ گئے۔ سرسید کے اثر سے وہ خدمت خلق میں لگ گئے اور اپنے طبعی جوہر اور خلوص سے علی گڑھ تحریک کے پیغام کو بہار میں گھر گھر تک پہنچا دیا۔ انھوں نے محمدن اینگلو عربک اسکول پٹنہ، مدرسہ اسلامیہ بہار مدرسہ احمدیہ آرہ، مدرسۃ النبات وغیرہ کے قیام اور ان کے چلانے میں اپنی دولت کا بڑا حصہ صرف کیا۔ علی گڑھ کالج کی اعانت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور بعض اوقات چندہ کی وصولیابی کے لئے سرسید کے ساتھ ڈپوٹیشن میں بھی شریک سفر رہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ "قاضی سید رضا حسین رئیسِ پٹنہ، خلیفہ سید محمد حسن وزیر پٹیالہ مولوی چراغ علی اور میر ظہور حسین کے مرنے کا ان (سرسید) کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا"

محمد کریم : لطف محمد کے بیٹے محمد کریم ۱۸۲۹ء میں محمد آباد کہنہ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کا آغاز پرگنہ محمد آباد ضلع اعظم گڑھ کے قانون گو کی حیثیت سے کیا اور کچھ دنوں بعد اعظم گڑھ کلکٹریٹ میں نائب منشی اور بعد میں وہیں نائب سررشتہ دار ہوئے۔ پرگنہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ اور ضلع فیض آباد میں تحصیلدار رہے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ضلع گورکھپور کی تحصیل بانسی میں تحصیلدار ہوئے ۱۸۶۰ء میں ضلع گورکھپور کے سٹلمنٹ

ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے ان میں نئے خیالات کے اخذ کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ذمہ داری کا بے پناہ احساس تھا اس لئے ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے ان کے افسرانِ بالا، دفتر کا عملہ اور عوام اُن سے مطمئن رہے، ان کی زندگی خدمت اور ایثار کی ایک روشن مثال تھی۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کا افتتاحی جلسہ ہوا تو اس کی صدارت محمد کریم نے کی۔ یہ اس زمانے میں علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اسی زمانے میں انھیں سرسید سے قریب ہونے کا موقع ملا اور وہ ان کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور بڑے خلوص و انہماک سے انھوں نے مدرسۃ العلوم کے کاموں میں سرسید کا ہاتھ بٹایا۔ وہ سرسید پاکیز گہر کی محبت میں اس قدر کھو گئے تھے کہ ان پر من تو شدم تو من شدی کی مثال صادق آتی ہے۔ علی گڑھ گزٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسۃ العلوم کی کمیٹیوں کے ممبر اور صدر کی حیثیت سے مختلف مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ سرسید اپنے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "باقی ہمارے دوست جیسے جناب مولوی سید زین العابدین خان بہادر جناب مولوی محمد کریم صاحب، میر سید ظہور حسین صاحب، مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب پیر جی محمد عارف صاحب ایسے ہیں جن کو اس سے غرض نہیں کہ وہ (سرسید) کیا کہتا ہے اور کیا بکتا ہے، اپنی دوستی کے برتنے سے کام رکھتے ہیں جو کچھ کہو کرنے کو موجود، خفا ہو تو اس کی برداشت کرنے کو حاضر"

مولوی رونق علی: ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے مولوی رونق علی ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء تک اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے جب ریاست پٹیالہ میں نولکشور پریس قائم ہوا تو مولوی رونق علی نے وہاں کا کاروبار سنبھالا اور پٹیالہ اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کے علم و فضل کا اس زمانہ میں اعتراف کیا جاتا تھا اور اہلِ لکھنؤ انکی زباندانی کا لوہا مانتے تھے افسوں تخلص تھا۔ خلیفہ محمد حسن، انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے ان کے مضامین کی تعریف انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کرتا تھا۔

منشی وجاہت علی: منشی وجاہت علی اپنے زمانے کے مشہور صحافیوں میں تھے شاعری بھی کرتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے میرٹھ سے اخبار عالم کا اجرا کیا۔

مولوی کبیرالدّین احمد خاں : کلکتہ میں جسٹس آف دی پیس تھے۔ اخبار اردو گائڈ کے مالک یہی تھے۔ گارساں دتاسی نے اخبار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کثیرالاشاعت روزنامہ اخبار تھا۔ مولانا آزاد لسان الصدق میں لکھتے ہیں کہ مولوی کبیرالدین احمد کے مظہرالعجائب پریس نے بھی اپنے زمانے میں اچھی اچھی کتابیں چھاپیں۔

حافظ عبدالرّزاق : یکم نومبر ۱۸۶۷ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۸۷۸ء تک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ حافظ عبدالرزاق کے اہتمام میں نکلتا رہا۔ حافظ عبدالرزاق انسٹی ٹیوٹ پریس میں کمپوزیٹر تھے اور مطبع کا اہتمام بھی انھیں کے سپرد تھا۔

مُنشی ذوالفقار خاں : الہ آباد کے رہنے والے تھے لیکن ۱۸۵۷ء میں منشی ذوالفقار نے بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا لیکن اپنی محنت سے ضروری تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں انگریزی حکومت کی ملازمت کی بعد میں علی گڑھ آ گئے اور کمیٹی مدرستہ العلوم کے دفتر کا کاروبار سنبھالا۔ سرسید لکھتے ہیں "جو لوگ ہمارے مدرستہ العلوم سے علاقہ رکھتے ہیں اب ان کی تعریف میں بڑے بڑے لوگوں کو قصائد مدحیہ کہنے کی آرزو ہوتی ہے سید محمود صاحب نے جنھوں نے چند مہینہ علی گڑھ میں رہنے کا ارادہ کیا ہے چند اشعار فارسی مُنشی ذوالفقار صاحب منشی کمیٹی مدرستہ العلوم کی مدح میں لکھ کر گذارے ہیں جسکے انعام میں منشی صاحب ممدوح نے شیرنی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اگرچہ سید محمود نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا یہ پہلے ہی ان کے اشعار ہیں مگر ہم ان کو اس لئے درج اخبار کرتے ہیں کہ ہمارے مدرستہ العلوم کی کمیٹی کے منشی صاحب کی مدح مشتہرۂ آفاق ہو۔"

احمد حسین : میر ولایت حسین لکھتے ہیں۔ "۱۸۸۶ء میں ایم۔ اے او کالج کے اسکول اسٹاف کے کئی ممبران نے وکالت کی تیاری کے لئے ایک سال کی رُخصت لی تھی جن میں سکنڈ ماسٹر بھوانی چندر بی اے بھی تھے انکی جگہ پر عارضی تقرر ماسٹر احمد حسین کا ہوا تھا۔ اُنھوں نے اگست ۱۸۸۶ء میں اسکول جوائن کیا تھا لیکن تھوڑے ہی دن بعد موسمی بخار میں مُبتلا ہو گئے اور علی گڑھ کے ڈاکٹر مول راج اسسٹنٹ سرجن کے زیر علاج تھے انھوں نے انھیں کوئی پسینہ لانے والی دوا غلطی سے دے دی جس سے پسینہ بکثرت آیا اور اسی میں انکا انتقال ہو گیا۔

لالہ گلاب رائے : حافظ عبدالرحمٰن کے بعد انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مہتمم لالہ گلاب رائے ہوئے۔ علی گڑھ گزٹ ۲۳ اپریل ۱۸۸۹ء تک ان کے اہتمام میں شائع ہوا۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں کسی روز انکا انتقال ہوا۔

دیوان کرپارام : دیوان جوالا سہائے کے بیٹے دیوان کرپارام ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت میں دیوان تھے وہ فارسی اچھی جانتے تھے اور فارسی میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور انھیں بقول صوفی غلام محی الدین رنبیر سنگھ کے دربار کا ابوالفضل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ابوالفضل کی وسعت نظری کے مقابلہ میں ان میں اپنے مذہب کی پاسداری زیادہ تھی۔ انھوں نے جموں میں ایک سوسائٹی بھی قائم کی تھی جہاں مختلف مسائل پر مباحثے ہوتے تھے۔ انھوں نے سوسائٹی کی جانب سے ایک ہفتہ وار اخبار بدیا بلاس بھی جاری کیا تھا۔

چوبے دھنپت رائے : چوبے بندرابن داس کے بیٹے چوبے دھنپت رائے مُراد آباد میں پیدا ہوئے چوبے دھنپت رائے راجہ جے کشن داس کے بھائی تھے جن سے سرسید کے بڑے گہرے روابط تھے۔

حاجی فیض احمد خاں : فیض احمد خاں ۲۶۔ ۱۸۲۵ میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء کی شورش میں یہ مجاہدین حریت کے ہمدرد تھے انھوں نے بادشاہ دہلی کی اپیل پر مجاہدین کے لئے ایک ہزار روپیہ بطورِ نذر دہلی بھیجا تھا۔ حکام انگریزی فیض احمد خاں کی طرف سے مشکوک تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انھیں گرفتار کیا گیا۔ اس واقعہ سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں حاجیوں کے قیام کے لئے کئی عمارتیں بنوائیں۔

عنایت اللہ خاں : داؤد خاں کے بیٹے عنایت اللہ خاں دودمان شروانی کے روشن خیال رئیسوں میں تھے اُن کی مساعی سے علی گڑھ تحریک کا دائرہ وسیع ہوا۔ وہ علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی کے پرجوش ممبر تھے۔ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے ایک سونے کی اشرفی جس پر تغلق شاہ کا سکہ ثبت تھا بطور ڈونیشن سوسائٹی کو دیا تھا۔ انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے

باغ میں اپنے خرچ سے ایک فوّارہ بھی بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے بھی رکن تھے اور علی گڑھ کالج کی محبت میں وہ بھی سرسید کی روش پر چلنے کی کوشش کرتے تھے عنایت اللہ خاں کے سلسلے میں حالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب سائنٹیفک سوسائٹی کی عمارت تیار ہوئی تو کمشنر میرٹھ کو اُس کے افتتاح کے لئے مدعو کیا گیا کمشنر میرٹھ کے دل میں عنایت اللہ خاں کی جانب سے ایّام غدر کے زمانے کے کچھ شبہات تھے اور وہ اُن کی موجودگی میں عمارت کی رسم افتتاح میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے کمشنر میرٹھ نے سرسید سے کہا تھا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اس کو شریک نہ کیا جائے" انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے آخر مسٹر برملی نے جو علی گڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور ان کو عنایت اللہ کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی"۔

نواب کلب علی خاں :۔ نواب کلب علی خاں ۱۹ر اپریل ۱۸۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۰ر جون ۱۸۶۵ء کو نواب کلب علی خاں باضابطہ طور پر مسند نشیں ہوئے مسند نشینی کے جشن میں غالب بھی شریک ہوئے تھے۔ یکم مارچ ۱۸۷۴ء کو سرسید رامپور آئے اور نواب کلب علی خاں نے مدرسۃ العلوم کے لئے دس ہزار روپیہ نقد دیا اور سو روپیہ ماہوار مقرر کیا مدرسۃ العلوم کے ایک جلسہ میں سرسید کہتے ہیں کہ ہم اسی احسان مندانہ فخر کے ساتھ ہز ہائینس نواب کلب علی خاں کا نام بیان کرتے ہیں جن کو کمیٹی مدرسۃ العلوم کے پیٹرن ہونے کی حیثیت سے ہماری کوششوں کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔

مرزا فیروز حسن خاں: دودمان تیموریہ کے مرزا فیروز حسن جہاں روشن جنال رئیس تھے فیروز نامہ ترک مولفہ شاہ صادق حسینی کو انھوں نے اپنے خرچ سے چھپوایا تھا اور اس کی آمدنی ترکوں کی امداد کے لئے مخصوص کی گئی تھی انھوں نے یورپ کا بھی سفر کیا تھا۔

میر لائق علی : میر لائق علی ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۹ء انتقال ہوا۔ علی گڑھ کالج کو ان کی تائید حاصل تھی۔

مرزا سلیمان جاہ : عالمگیر ثانی کی آل مرزا الٰہی بخش کے بیٹے مرزا سلیمان جاہ پدرم سلطان بود کے نشے سے دور تھے انکے خاندان نے دلی میں خود بینی کو دور کرنے کے لئے مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ غدر سے پہلے " دہلی کے کل سلاطین الا ماشاء اللہ ایسے تھے کہ جن کو بیس ۲۰ تک گنتی نہ آتی تھی سب کی زبان میں زنانی بولیاں اور عورتوں کی سی باتیں اور شیخ چلیوں کے سے خیالات بھرے ہوئے تھے وہ دنیا کی کسی بات کو نہ جانتے تھے بجز اس خیال کے کہ ہم بادشاہ زادے ہیں خواہ مخواہ واجب التعظیم ہیں۔۔۔۔ سلاطین زمانہ ماقبل غدر بھی نہایت بااخلاق تھے اور لوگوں سے سادی وضع سے ملتے تھے بلکہ ہم کو یہ کہنا چاہیئے کہ اخلاق خاندانِ تیموریہ میں عام تھا بڑے بڑے ذی عزت بادشاہ زادے، بادشاہ زادیاں جن کی جن سے ملاقات تھی نہایت اخلاق و محبت و دوستانہ طریقے پر ملتے تھے مگر وہ پٹھ حماقت کی کہ ہم بادشاہ زادے ہیں اور خواہ مخواہ واجب التعظیم ہیں سب میں لگی ہوئی تھی اور بیٹھنے میں اور بات چیت کرنے میں اس کی رعایت ضرور چاہتے تھے ایک غریب شاہزادہ جو پیدل دو پیسہ کا کبوتر ہاتھ میں لئے ہوئے چوک کو نیچے جاتا تھا اس کی بھی یہ خواہش ہوتی تھی کہ لوگ مجھ کو صاحب عالم کہیں اور حضور سے مخاطب کریں مگر مرزا ثریا جاہ اور اُن کے بھائی مرزا سلیمان جاہ میں اس قسم کے نادانی کے خیالات مطلق نہیں ہیں وہ پورے پورے ایک اشراف جنٹلمین کی مانند لوگوں سے ملتے ہیں اور جس طرح ایک اشراف کو ایک اشراف کے ساتھ ملنا اور تعظیم و تواضع و اخلاق سے پیش آنا چاہیئے اسی طرح پیش آتے ہیں اور غالباً یہ اثر تربیت خود ان کے والد ماجد مرزا الٰہی بخش صاحب کا ہے کیوں کہ زمانۂ غدر سے پہلے مرزا الٰہی بخش صاحب ان تمام باتوں کی برائیوں کو سمجھ گئے تھے اور انھوں نے اپنا طریقہ دیگر سلاطین سے بالکل بدل دیا تھا۔"

قدیم دہلی کالج کو جب دوبارہ بحال کرنے کی کوشش شروع ہوئی تو سلیمان جاہ نے دامے درمے مدد کی جب حکیم عبدالمجید نے دہلی میں طبیہ کالج قائم کرنے کی تجویز پیش کی تو اس میں بھی مرزا سلیمان جاہ نے بڑھ کر حصہ لیا۔ علی گڑھ کی مسجد میں سورۂ الفجر کا جو

کتبہ ہے اُسے بھی مرزا سلیمان جاہ نے دیا تھا۔ ذکاء اللہ لکھتے ہیں" عمارت کی شان و شوکت کے اعتبار سے مسجد جامع کے بعد اکبر آبادی مسجد شمار ہوتی تھی۔ اس کو شاہ جہاں کے حکم سے اس کی زوجہ نواب افسر النساء بیگم عرف اکبر آبادی محل نے شاہ جہاں کے بازار فیض بازار میں دو برس میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوایا تھا وہ ماہِ رمضان ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں بن کر تیار ہوئی۔ اس کے دالان بڑے شاندار تھے اس کے آگے چبوترہ اور چبوترے کے آگے حوض تھا۔ صحن کے مسجد کے گرد طالب علموں کے پڑھنے کے لئے حجرے بنے ہوئے تھے دروازہ کے اوپر کتبہ سنگِ موسیٰ کی پچی کاری کا کھدا ہوا تھا.... جب سے یہ مسجد بنی تھی اس کی مرمت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اس دو برس کے عرصہ میں وہ فرسودہ اور شکستہ ہو رہی تھی۔ میں نے اس کو ۱۸۵۷ء میں اس حال میں دیکھا کہ اس میں ابابیلیں بستی تھیں چمگادڑیں بیٹ کرتی تھیں اس کے پاس بگوا بازی ایک محلہ تھا اس میں کشمیری رہتے تھے وہ اس کے ٹوٹے پھوٹے حجروں میں کارچوبوں پر شال بانی کیا کرتے تھے۔ اس لئے اس مسجد کا نام کشمیری کٹرہ کی مسجد زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔ اس میں جاڑے کے موسم میں کشمیری کابلی پشمینہ فروش اترتے تھے ان لوگوں کے کرائے سے مجد کے خرچ چلتے تھے جب مولوی رحمت اللہ اس مسجد میں رہنے کے لئے آجاتے تھے تو دس پانچ طلبہ اُن سے پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب عیسائی مذہب کے برخلاف مباحثات میں ایسے نامور تھے کہ جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو سلطان اعظم روم نے قسطنطنیہ میں بلوا کر عیسائی مذہب کے رد میں ایک کتاب اظہار حق لکھوا کر شائع کرائی غدر کے بعد جب سرکار انگریزی کو قلعہ کے آگے میدان بنانے کی ضرورت ہوئی تو اس میدان میں یہ مسجد مسمار ہو کر بالکل بے نام و نشان ہو گئی مگر اس کے اندر کے صدر کے دالانوں کے محرابوں پر باہر کی طرف سنگ مرمر کے پتھروں پر قرآن شریف کی سورۂ والفجر قاضی عصمت اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کندہ تھی۔ قاضی صاحب خط نسخ میں ایسے کامل خوشنویس تھے کہ ان کے برابر شاید ہی دو چار خوش نویس ہوئے ہوں جب یہ مسجد مسمار ہوئی تو اس کے یہ بے نظیر کتابے مرزا الٰہی بخش کو گورنمنٹ نے دے دیئے۔ سر سید ان کتبوں کے بڑے قدر شناس تھے جب انھوں نے علی گڑھ کالج میں مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو صاحب عالم سے فرمائش کی کہ ان کتابوں کو کالج کی مسجد میں نصب کرنے کے لئے مرحمت فرمائے صاحب عالم نے جواب دیا کہ جب آپ اپنے مدرسہ میں اکبر آبادی

جیسی مسجد بنوائیں گے تو میں ضرور آپکو یہ کتابے دیدوں گا کہ وہ وہاں نصب ہو کر مسجد کو رونق دیں۔ صاحب عالم کا انتقال ہو گیا تو سرسید نے ان کے فرزند مہین مرزا سلیمان جاہ سے ان کتابوں کے عنایت کرنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اپنے والد ماجد کی طرح محبت نہیں کی۔ علی گڑھ میں کتابے بھجوا دیئے۔ بھلا علی گڑھ کا بج میں تو ایسی وسیع والا شان مسجد کب بن سکتی تھی کہ ان کے محرابوں پر یہ کتابے لگتے۔ اس لئے سرسید نے کتابوں کی سطروں کی قاشیں کتر کر اور جوڑ کر مسجد میں چسپاں کیں جو نہایت خوشنما معلوم ہوتی ہیں۔

سرسید کو دعا دینی چاہیئے کہ انھوں نے ان بے مثل کتابوں کو سنگ ریزہ ہونے سے بچا کر ایک خانۂ خدا سے دوسرے خانۂ خدا میں منتقل کر دیا۔

جنرل اعظم الدین خاں: نواب جلال الدین خاں کے بیٹے جنرل اعظم الدین خاں ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد میں ہوئی۔ انٹرنس کی سند بریلی کالج سے حاصل کی ان کی طبیعت پر انگریزی تہذیب و معاشرت کا ذوق اور سپاہ گری کا شوق غالب تھا بڑے لائق اولوالعزم اور خلیق تھے نواب مشتاق خاں کے عہد میں ریاست رام پور کے مدار المہام تھے۔ شبلی نے ان کی وفات پر مرثیہ کہا وہ لکھتے ہیں "اگرچہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے تاہم جب جو واقعہ عالم آشوب و جانگداز ہوتا ہے وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا۔ اس قحط الرجال میں جنرل اعظم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئی تھیں ان کے لحاظ سے انکی عبرت انگیز موت عجیب افسوس ناک حادثہ ہے۔ مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا لیکن ان کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں۔"

نواب عبداللطیف خاں بہادر: نواب عبداللطیف ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوئے انھوں نے بنگال میں مسلم جدید کاری کی ابتدا کی سرکاری ملازم تھے ۱۸۶۱ء میں لفٹنٹ گورنر بنگال نے انھیں بنگال لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا وہ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے ممبر بھی رہے

۱۸۶۳ء میں اسلامی مجلس مذاکرۂ علمیہ کے سکریٹری مولوی عبداللطیف کی دعوت پر سرسید نے بھی مجلس کے ممبران کو خطاب کیا۔ مولوی عبداللطیف کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو اور بنگال کی سوشل سائنس ایسوسی ایشن کے رکن تھے۔

خلیفہ سیّد محمّدؐ حسَن : ریاست پٹیالہ کے شاہی طبیب حکیم سید سعادت علی کے بیٹے خلیفہ سید محمّد حسن نے ۱۸۵۰ء میں سولہ سال کی عمر میں ریاست پٹیالہ کے جوڈیشیل منسٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ ریاست کے فارن منسٹر ہوئے اور ۱۸۷۰ء میں وہ پٹیالہ کے پرائم منسٹر مقرر ہوئے۔ خلیفہ سید محمد حسن کے والد مہاراجہ کرم سنگھ کے اتالیق تھے۔ اس نسبت سے ان کا خاندان خلیفہ کے لقب سے مشہور ہے۔ سید محمّد حسن جدید تعلیم کے سرگرم حامیوں میں تھے۔ انھوں نے ریاست میں ایک باقاعدہ سررشتہ تعلیم قائم کیا جس کا ڈائریکٹر ماسٹر رام چندر کو مقرر کیا۔ انھوں نے ابتداء سے علی گڑھ تحریک سے عملی دلچسپی لی۔ سرسید کے دست و بازو بنے رہے ان کے اثر سے مہاراجہ پٹیالہ نے مختلف میں علی گڑھ کالج کی امداد کی۔ مدرسۃ العلوم میں جب مسجد کی تعمیر کا فیصلہ ہوا تو یہ بحث شروع کی کہ سنیوں اور شیعوں کیلئے علیٰحدہ علیٰحدہ مسجد کی تعمیر کی جائے لیکن باوجود اس کے کہ سید محمد حسن راسخ العقیدہ شیعہ تھے انھوں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ تجویز اس اتحاد و یکجہتی کے منافی ہو گی جس کے قائم کرنے کے لئے ہم سب نے مدرسۃ العلوم قائم کیا ہے۔

۱۸۷۹ء میں جب خلیفہ محمد حسن کے ہاں پوتا پیدا ہوا تو سرسید مبارک باد دینے اور بچے کی پیدائش کی چراغی لینے پٹیالہ پہنچ گئے اور وہاں بھری محفل میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دوستوں میں مدرسۃ العلوم کے لئے برت بجھانی قائم کردوں تاکہ ہر قریب میں کچھ نہ کچھ چراغی کالج کو ملا کرے انکا خیال تھا کہ اس طرح سوا روپیہ یا پانچ روپیہ مدرسۃ العلوم کی چراغی کے دیئے سرسید نے محفل میں کھڑے ہو کر کہا کہ خدا بجھانوں کو آباد رکھے۔ دولت و اقبال بیٹوں اور پوتوں سے نہال کرے اور ایسی چراغیاں ہمیشہ خدا دینی نصیب کرے۔ اس کے جواب میں خلیفہ محمد حسن کے چھوٹے بھائی نے کہا کہ خدا ہمارے ایسے پروہت کو بھی سلامت رکھے۔

خلیفہ محمد حسن عربی و فارسی کے نامور عالم تھے اور ہندی زبان پر بھی اچھی دستگاہ

تھی اور اپنے اوقاتِ فرصت میں علماء کے ساتھ علمی مذاکرات میں بسر کرتے تھے انھوں نے اعجاز التنزیل کے علاوہ تاریخ پٹیالہ بھی تصنیف کی جسے سفیر ہند پریس نے پادری رجب علی ایڈیٹر سفیر ہند کے اہتمام میں چھاپا۔ خلیفہ سید محمد حسن سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے ممبر تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے جب سرسید نے علی گڑھ کالج کے چندہ کے لیے پنی ریڈنگ تھیٹر کی تجویز پیش کی تو پرنس بسمارک کا رول خلیفہ سید محمد حسن کو دیا گیا تھا۔ ان کی وفات پر حالی نے قطعہ تاریخ کہا ہے

شیو پرشاد: اردو ہندی کے مشہور اہلِ قلم تھے ہندوستان کی مختصر تاریخ ہندی میں لکھی ہے جس کا ترجمہ جام جہاں نما کے نام سے اردو میں کیا ہے تاریخ کی اس کتاب پر ڈائریکٹر مدرسۂ تعلیم شمال مغرب نے اعتراض کیا تھا کہ اس کتاب سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا ہوگی۔

مآخذ و مصادر

۱۔ آثار الصنادید ۔ سر سید مطبع سید الاخبار دہلی ۱۸۴۷ء

۲۔ آپ بیتی ۔ میر ولادت حسین علی گڑھ ۱۹۷۰ء

۳۔ آریہ سماج کی تاریخ ۔ لالہ لاجپت رائے ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۷ء

۴۔ اخبار الصنادید ۔ نجم الغنی نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء

۵۔ اختر شاہنشاہی ۔ سید محمد اشرف نقوی لکھنؤ ۱۸۸۸ء

۶۔ العلم ۔ کراچی

۷۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ عبداللہ یوسف علی ۔ الہ آباد ۱۹۳۶ء

۸۔ انتخاب ذکاء اللہ ۔ اصغر عباس ۔ اردو اکیڈیمی لکھنؤ۔ ۱۹۲۲ء

۹۔ تاریخ پٹیالہ خلیفہ سید محمد حسن سفیر ہند پریس امرتسر ۱۸۷۸ء

۱۰۔ تاریخ عباس ۔ عزیز لکھنوی لکھنؤ ۱۳۴۴ھ

۱۱۔ تاریخ مظاہر ۔ مولانا محمد زکریا

۱۲۔ تاریخ صحافت اردو امداد صابری کلکتہ

۱۳۔ تاریخ دیوبند سید مجیب رضوی ۱۹۷۲ء

۱۴۔ تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمان علی ترجمہ ایوب قادری ۱۹۶۱ء

۱۵۔ جام جہاں نما راجہ شیو پرشاد الہ آباد ۱۸۸۱ء

۱۶۔ حیاتِ جاوید مولانا حالی انجمن ترقی اردو ۱۹۰۱ء

۱۷۔ حیاتِ رضا — سید عبدالغنی — علی گڑھ — سنہ ۱۹۳۵ء

۱۸۔ حیاتِ اجمل — قاضی عبدالغفار — انجمن ترقی اردو

۱۹۔ خطبات گارساں دتاسی — انجمن ترقی اردو — سنہ ۱۹۳۵ء

۲۰۔ سفرنامہ پنجاب — سرسید — لاہور — سنہ ۱۹۷۲ء

۲۱۔ لسان الصدق — ابوالکلام آزاد — کلکتہ

۲۲۔ مسافرانِ لندن — سرسید — لاہور — سنہ ۱۹۶۱ء

۲۳۔ موج کوثر۔ — شیخ محمد اکرام — لاہور — ۱۹۶۳ء

۲۴۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی — غلام مرسلین — مرکز دراسات ایشیائے غربی مسلم یونیورسٹی ۱۹۸۵ء

۲۵۔ تذکرہ ذاکر — مالک رام

۲۶۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ — سنہ ۱۸۶۸ء تا سنہ ۱۸۹۵ء

۲۷۔ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج۔ رفیق زکریا۔ ترقی اردو بیورو سنہ ۱۹۸۵ء

۲۸۔ AIN-I-AKBARI - BLOCHMANN

MUSLIM POLITICS IN BENGL

BY JAYANTI MAITRA

۲۹۔ THE NIZAM BETWEEN MUGHALS

AND BRITISH BY VASANT KUMAR

ڈاکٹر اصغر عباس نہ صرف "نیک در گیرو محکم گیر" کے قائل ہیں بلکہ اس مقولہ پر بڑے خلوص اور انہماک کے ساتھ عمل بھی کرتے رہے ہیں۔ ان کی پہلی علمی تحریر سرسید سے متعلق تھی اور پھر انھوں نے جو کچھ لکھا سرسید اور علی گڑھ تحریک کے دائرے میں رہ کر لکھا۔ یہی سبب ہے کہ آج جب سرسید شناسوں کی فہرست مرتب کی جاتی ہے تو اس میں ان کا نام شامل رہتا ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید پر بہت کم لکھا گیا لیکن اس حقیقت کو چھپایا بھی نہیں جا سکتا کہ ابھی سرسید پر اتنا مواد موجود ہے کہ اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اصغر عباس نے مسلسل کوشش کی کہ مخفی مواد کو عام کیا جائے اور اس طرح سرسید کی تفہیم کی راہیں وسیع کی جائیں ان کی زیر نظر نئی کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

محمود الٰہی

1391